الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ

اشرفیہ

مبارکپور

مبارک حسین مصباحی

جنوری 2010

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبدالعزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ

مبارکپور
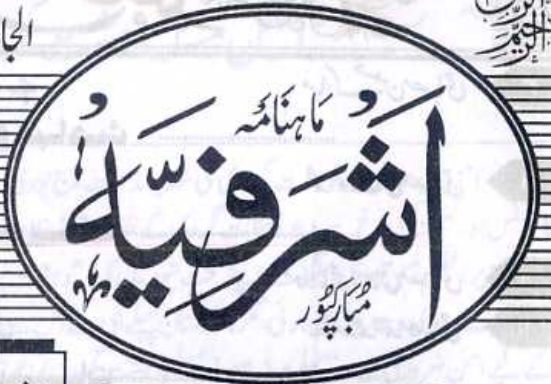
زیرِ سرپرستی

عزیزِ ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبدالحفیظ صاحب قبلہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

محرم ۱۴۳۱ھ

جنوری ۲۰۱۰ء

جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۱

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ — مبارک حسین مصباحی

سرکولیشن منیجر — محمد محبوب عزیزی مصباحی

تزئین کار — مہتاب پیامی

مجلسِ مشاورت

مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی

مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی

مولانا محمد ادریس بستوی مصباحی

مولانا عبدالمبین نعمانی مصباحی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور

اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur. Azamgarh

(U.P.) India. 276404

قیمت عام شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 150 روپے

چیک اور ڈرافٹ

بنام

مدرسہ اشرفیہ

بنوائیں

کوڈ نمبر ——— 05462

دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149

الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092

دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122

سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ

500 روپے

دیگر بیرونی ممالک

20 $ امریکی ڈالر 15 £ پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

نقوشِ قلم

....اصل مسئلہ دہشت گردی کی مضبوط حمایت ہے

مبارک حسین مصباحی

امن کی تلاش اور دہشت گردی کی شدید مذمت آج پوری دنیا کی اولین ترجیح بنی ہوئی ہے۔ ملکی اور عالمی سطح پر کسی بھی موضوع پر کانفرنس ہو، کسی نہ کسی رُخ سے بات دہشت گردی کے خلاف چھڑ ہی جاتی ہے۔ چند روز قبل ہندوستانی اقتصادی چوٹی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم من موہن سنگھ نے اپنے سخت تیور میں کہا: "دہشت پسندی عالم انسانیت کے لیے بذاتِ خود ایک بڑا خطرہ ہے۔ دنیا ۹/۱۱ کے بعد دہشت پسندی سے روشناس ہوئی، مگر ہندوستان پہلے ہی سے اس سے بر سرِ پیکار ہے۔" ڈاکٹر من موہن سنگھ نے کہا کہ "ہندوستان کی ترقی کے لیے امن ضروری ہے۔" "پہلے میڈیا صرف مسلم دہشت گردی کو اچھالتی تھی مگر جب ہیمنت کرکرے کی سر براہی میں اے. ٹی. ایس. نے انصاف اور جرأت کا مظاہرہ کیا تو کئی چہرے بے نقاب ہو گئے۔ پہلے صرف مسلم دانش ور کہتے تھے کہ دہشت گردی کو کسی مذہب سے جوڑنا ٹھیک نہیں، اب دیگر مذاہب سے وابستہ اہل سیاست بھی یہی اعلان کر رہے ہیں۔ راجیہ سبھا میں ۲/ دسمبر کے ایک مباحثہ میں وزیرِ داخلہ پی. چدمبرم نے کہا: "ملک میں دہشت گردی کے پیچھے کسی خاص مذہب سے متعلق لوگوں کا ہاتھ نہیں۔ دہشت گردی الگ الگ مذہبی تنظیموں کی جانب سے پھیلائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں الگ الگ طرح کی دہشت گردی ہے اور اسے پھیلانے میں ہندو تنظیمیں بھی پیچھے نہیں ہیں۔"

بساطِ صحافت سے ایوانِ سیاست تک اس قسم کے بیانات آتے ہی رہتے ہیں لیکن کیا اس قسم کے مبہم بیانات سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو گا۔ اس قسم کے بیانات تو وہ لوگ بھی جاری کرتے رہتے ہیں جو خود دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ ضرورت ہے انصاف کے ساتھ سخت عملی اقدام کی۔ حکومت کے سامنے سری کرشنا رپورٹ بھی ہے اور اے. ٹی. ایس. کی تحقیقات بھی۔ اسی طرح اور بہت سے تجزیہ کاروں نے مجرمین کے چہرے بے نقاب کیے مگر بر سر اقتدار حکومت عام طور پر دہشت گردانہ معاملات کو سرد خانے میں ڈال دیتی ہے۔ کچھ دنوں تک سادھوی پرگیہ اور کرنل پروہت وغیرہ کے نام میڈیا میں اچھلے، انتظار تھا کہ اب دہشت گردی کی جڑوں پر کُدال چلے گی، لیکن ہیمنت کرکرے کے بعد سب کچھ منظر نامے سے اچانک غائب ہو گیا۔ ہاں یہ ضرور دیکھنے میں آتا ہے کہ گاہے بہ گاہے دہشت گردی مخالف سرگرمیاں دکھانے کے لیے عام شہریوں کا انکاؤنٹر کر کے فتح یابی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اصل مسئلہ دہشت گردی نہیں بلکہ ملک میں بدامنی کا اصل مسئلہ دہشت گردی کی مضبوط حمایت اور سرپرستی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف واویلا مچانے کا کوئی حاصل نہیں۔ ملکی اور عالمی سطح پر اولین ترجیح، ان افراد کی حوصلہ شکنی اور مذمت ہونا چاہیے جن کے سائے میں دہشت گردی پھل پھول رہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ کوئی مذہب دہشت گردی کی تعلیم نہیں دیتا اس لیے دہشت گردی کو کسی مذہب سے جوڑنا غلط ہے۔ نہ اسلام دہشت گرد ہے، نہ ہندو مذہب، نہ عیسائی مذہب دہشت گرد ہے اور نہ سکھ مذہب۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ہند اور بیرون ہند جو دہشت گرد ہیں یا جو تنظیمیں دہشت گرد ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی مذہب سے ضرور ہے۔ اس لیے ہم پوری سنجیدگی سے کہنا چاہتے ہیں کہ جب کسی فرد یا کسی تنظیم کی طرف سے دہشت گردی ہو یا دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہو تو ان کے مذہب کا ذکر کیے بغیر ان افراد اور ان تحریکوں کو سرِ عام بے نقاب ضرور کیا جائے۔ مگر افسوس! ایسا نہیں ہوتا۔ جب دہشت گردی کی کوئی واردات سامنے آتی ہے تو اسے ہم مذہب کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اسی رخ پر دہشت گردوں کی حمایت اور مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اندازِ فکر غلط ہے۔ اس سے انصاف کے تقاضے متاثر ہوتے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں تو اس روش سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر ہندوستان سے دہشت گردی کی جڑیں اکھاڑنا ہے تو ہمیں دہشت گردی کی حمایت والی فکر کو کچلنا ہو گا۔ بلکہ زمینی سچائی یہ ہے کہ دہشت گرد تو صرف آلۂ کار ہوتے ہیں۔ دہشت گردی کے حقیقی مجرم وہ سفید پوش ہوتے ہیں جو انھیں نقشہ، اسلحہ اور سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے پر ہوتا ہے کہ ہمیں تلوار تو نظر آتی ہے قاتل نظر نہیں آتا اور خاک و خون میں غلطاں پورے منظر نامے میں یہ شناخت مشکل ہوتی ہے کہ قاتل کون ہے اور مسیحا کون، مجرم کون ہے اور منصف کون؟ ۲۶/۱۱ کا

Mubarakhusain@ymail.com

ممبئی حادثہ بھی کچھ اسی طرح کا معمہ بنا ہوا ہے، جیسے جیسے تحقیقات کا سفر آگے بڑھ رہا ہے۔ پردے کے پیچھے نت نئے چہرے نمودار ہو رہے ہیں۔

دہشت گردی اور دہشت گردی کی حمایت اس وقت دنیا کا انتہائی نازک مسئلہ ہے مگر اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو اور مسلمانوں میں آج بھی ایک بڑا طبقہ انصاف پسند ہے اور وہ چاہتا ہے کہ حقیقی مجرمین کے چہرے سرِ عام بے نقاب ہوں اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں سخت سزائیں دی جائیں۔ ہمارے سامنے اس کی تازہ مثال گوا کے وزیرِ داخلہ کی ہے۔ مسٹر روی نائک نے واضح طور پر کہا کہ ہندو نواز تنظیم "سناتن سنستھا" نہ صرف گوا بلکہ پورے ملک کے لیے خطرہ ہے۔ تنظیم نے پہلے مہاراشٹر میں سازش کی اور اب گوا کے مختلف علاقوں میں دھماکے کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔" کانگریس کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر نائک نے راجیہ سبھا میں سوال اٹھاتے ہوئے کہا: "سناتن سنستھا گزشتہ ۱۵/ برسوں سے سائنسی روحانیت کی آڑ میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کو فروغ دے رہی ہے۔ دیوالی سے قبل مالے گاؤں میں ہوئے بم دھماکوں کے تار مبینہ طور پر سناتن سنستھا سے جڑے ہوئے ہیں، پولیس کے پاس اس کے پختہ ثبوت ہیں۔"

دہشت گردی کا خاتمہ یا دہشت گردی پر سیاست یہ دونوں باتیں انتہائی اہم اور باہم متضاد ہیں، مگر ان دونوں باتوں میں خطِ امتیاز کھینچنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لیے اب حکومتوں اور عدالتوں کو نفظوں کے خول سے نکل کر عملی قدم اٹھانا ہوگا۔ اگر دہشت گردی کے حوالے سے کوئی بات سامنے آتی ہے تو سنجیدگی سے غور کرنا اور تحقیق کے بعد سخت کارروائی کرنا چاہیے اور اس کی کوئی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ مجرمین کا تعلق کس مذہب، کس تحریک اور کس ملک سے ہے۔ اور سچ سامنے آنے کے بعد عوام کو بھی مجرمین کی حمایت میں نعرے لگانے سے سخت گریز کرنا چاہیے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ۲۶/۱۱ کی پہلی برسی کے موقع پر بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستان کے مشہور قانون داں رام جیٹھ ملانی کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ رام جیٹھ ملانی نے جب دہشت گردی کے پس منظر میں وہابی تحریک کا نام لیا تو سعودی سفیر اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ مرکزی وزیر قانون ویرپا موئلی نے سعودی سفیر کو منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ حکومت رام جیٹھ ملانی کے بیان سے اتفاق نہیں رکھتی۔ سعودی عرب کے سفیر کو مسٹر رام جیٹھ ملانی سے بحث کر کے یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ وہابی تحریک دہشت گرد تحریک نہیں ہے۔ سچ کا سامنا کرنے سے انھوں نے گریز کیوں کیا؟ آیئے دیکھتے ہیں ۲۶/۱۱ کی پہلی برسی کے موقع پر منعقد انٹرنیشنل کونسل آف جیورسٹ کے ذریعہ منعقدہ اجلاس میں کیا کہا تھا رام جیٹھ ملانی نے:

"میں نے کئی مرتبہ قرآن کا مطالعہ کیا ہے، پیغمبر محمد ﷺ نے امن کا پیغام دیا، قرآن نفرت اور تشدد نہیں سکھاتا۔ لیکن سترہویں صدی میں سعودی عرب میں وہاب (محمد بن عبد الوہاب نجدی) نامی شخص نے غیر مسلموں کے خلاف تشدد کی مہم چلائی۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کی غلط تشریح کی اور اس کا بے جا استعمال کر کے نفرت کے بیج بوئے۔" رام جیٹھ ملانی نے مزید تشریح کرتے ہوئے کہا: "میں نے وہاب (محمد بن وہاب نجدی) کے ذریعہ پیش کی گئی آیت کا کئی بار مطالعہ کیا، لیکن مجھے اس میں کہیں بھی غیر مسلموں کے خلاف نفرت کی بات نظر نہیں آئی وہاب نے کہا تھا کہ عیسائی، یہودی اور ہندوؤں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

ماہر قانون مسٹر رام جیٹھ ملانی نے صدر جمہوریہ پرتبھا پاٹل سمیت اہم شخصیات کی موجودگی میں مزید کہا: "بہت افسوس ناک بات ہے کہ اسلام کو دہشت گردی کے لیے قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہندو اور بودھ دھرم کے ماننے والے بھی کئی دہشت گرد ہیں۔ دہشت گردی کو بڑھاوا دینے اور دہشت گردوں کو مالی امداد دینے والے ملک سے ہندوستان کو سفارتی تعلقات ختم کر لینے چاہئیں۔

رام جیٹھ ملانی کا یہ بیان ملک کے بڑے اخباروں میں شائع ہوا، الیکٹرانک میڈیا میں بھی نشر ہوا۔ حکومت اور انصاف پسند دانش وروں کو چاہیے کہ وہ اس بیان پر غور کریں اور سچائی کی تلاش کریں۔ مگر افسوس! اس بیان کو بھی بعض دماغی مریضوں نے مذہبی تعصب کی عینک لگا کر دیکھنا شروع کر دیا، اس غیر جانب دارانہ بیان کو بھی اسلام پر حملہ قرار دیا گیا اور اب اردو میڈیا میں سلسلہ جاری ہے شیخ محمد بن عبد الوہاب اور وہابی تحریک کی حمایت کا۔ کیا اس طرح دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا؟ حالات کا شدید تقاضا ہے کہ ملک بھر میں اس موضوع پر مباحثے ہوں، وہابی نظریات اور اس کے سیاسی اور عملی کردار کا مطالعہ کیا جائے تاکہ ملک بھر میں پھیلی ہوئی گومگو کی فضا صاف ہو اور جو حق ہو اسے سامنے لایا جائے تاکہ ملک میں دراندازی اور دہشت گردی کا سلسلہ بند ہو۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کی حمایت میں اخبارات میں عجیب و غریب قسم کے بیانات و مضامین آ رہے ہیں۔ حجازِ مقدس میں وہابیوں نے جو ہزاروں مسلمانوں کو کافر و مشرک کہہ کر قتل کیا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی ستم گری کا نشانہ بنایا، مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے اس کے خلاف عالمی احتجاج کیا تھا۔ مگر افسوس! آج بعض قلم کار اسے مجاہدین ہند سے جوڑنے کی کوشش کہہ رہے ہیں پروفیسر اختر الواسع تو بے چارے وہابی نظریات و اقدامات سے قطعاً نابلد معلوم ہوتے ہیں اگر وہ مطالعہ کریں تو بآسانی سچائی کے کنارے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر مجھے حیرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی کے فرزند ارجمند مولانا ارشد مدنی پر ہے جنھوں نے اپنے باپ کی مشہور کتاب "الشہاب الثاقب" کے مضامین بھی فراموش کر دیے۔ مولانا ارشد مدنی رام جیٹھ ملانی کے بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شیخ محمد بن عبد الوہاب اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئے اور اور ۹۲/ سال کی عمر میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں وہ انتقال کر گئے۔ اپنے زمانہ میں نجد کے علاقہ میں بڑے عالمِ دین جانے جاتے تھے۔ ان کی ساری زندگی عقیدہ توحید کی تشہیر میں اور اچھے اعمال کی تلقین میں گزر گئی۔ ان کی تحریک خالص مذہبی تحریک تھی، انتہائی موثر تحریک تھی، جس کے نتیجے میں ان کے ماننے والوں اور ان کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والوں کی ایک بہت بڑی اور بہت مضبوط جماعت وجود میں آ گئی۔ دو ڈھائی سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کی تحریک کے اثرات انتہائی مضبوط انداز میں پائے جاتے ہیں۔" (راشٹریہ سہارا، لکھنؤ۔ ۱۱/ دسمبر ۲۰۰۹ء)

مولانا ارشد مدنی صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے یہ تاریخی سچائی ہے یا جمعیۃ العلمائی بیان بازی۔ ذرا اپنے حافظے پر زور ڈالیے۔ ۲/ ۳/ مئی ۲۰۰۱ء کو دہلی میں جمعیۃ العلما نے ملک گیر تحفظ سنت کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں غیر مقلد وہابیوں کے تعلق سے رام جیٹھ ملانی سے **بھی** زیادہ سخت باتیں کہی گئی تھیں۔ آپ کے برادرِ بزرگوار مولانا اسعد مدنی نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا: "یہ فرقہ ایک نوپید غیر مانوس فرقہ شاذہ ہے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو اہلِ حدیث بتاتا ہے، جب کہ تمام مسلمان اسے غیر مقلد، وہابی اور لامذہب کہتے ہیں۔"

جمعیۃ العلما مئی ۲۰۰۱ء میں لاکھوں افراد کی موجودگی میں یہ اعلان کر چکی ہے کہ وہابیت **ایک نیا فرقہ** شاذہ ہے جسے پوری دنیا کے مسلمان وہابی اور لامذہب کہتے ہیں۔ یہ سب **کچھ آپ** کی موجودگی میں ہوا تھا، اس طرح گویا جمعیۃ علمائے ہند نے وہابی تحریک کو اسلام ہی سے خارج قرار دے دیا ہے۔ اب ذرا آپ اپنے آپ کو **سنبھالیں** تو ہم آپ کے سامنے آپ کے پدرِ بزرگوار کی مشہور کتاب "الشہاب الثاقب" پیش کریں۔ یہ دیکھیے آپ کے والدِ گرامی شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی رقم طراز ہیں۔ "صاحبو! محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءِ تیرہویں صدی نجدِ عرب سے ظاہر ہوا اور چوں کہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا اس لیے اہلِ سنت و جماعت سے قتل و قتال کیا، ان کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا اور ان کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا کیا، ان کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا۔ اہلِ حرمین کو خصوصاً اور اہلِ حجاز کو عموماً اس نے تکلیف شاقہ پہنچائی۔ ہزاروں آدمی اس کے اور اس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔"

مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی مزید لکھتے ہیں: "وہ ایک ظالم و باغی، خوں خوار فاسق شخص تھا، اسی وجہ سے اہلِ عرب کو خصوصاً اس سے اور اس کے اتباع سے دلی بغض تھا اور ہے اور اس قدر ہے کہ اتنا قوم یہود سے ہے نہ نصاریٰ سے، نہ مجوس سے، نہ ہنود سے۔" (الشہاب الثاقب، ص: ۴۲)

مولانا حسین احمد مدنی صاحب اپنی اسی کتاب میں مزید لکھتے ہیں: "محمد بن عبد الوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہلِ عالم اور تمام مسلمانانِ دیار مشرک و کافر ہیں۔ ان سے قتل و قتال کرنا، ان کو اموال کو ان سے چھین لینا حلال اور جائز ہے، بلکہ واجب ہے۔" (الشہاب الثاقب، ص: ۴۳)

معلوم نہیں مولانا ارشد مدنی سچائی سے قصداً گریز کر رہے ہیں یا اپنے باپ کے مذہب سے راہِ ارتداد اختیار کر چکے ہیں۔ بہر حال مولانا حسین احمد مدنی کی تحقیق کے عین مطابق شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی اپنے ماننے والوں کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو کافر و مشرک سمجھتا تھا، سب کا مال چھین لینا جائز بلکہ واجب سمجھتا تھا، حجازِ مقدس میں ہزروں بے گناہ عورتوں بچوں اور مسلمانوں کو کافر جان کر قتل کیا اور اب یہی کام وہابی تحریک سے وابستہ طالبان پاکستان اور افغانستان میں کر رہے ہیں۔ اب ملک کے اہلِ سیاست، اہلِ صحافت اور ماہرینِ قانون کو یہ غور کرنا ہے کہ وہابی تحریک دہشت گرد تحریک ہے یا نہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک ہمارے ملک میں دہشت گردی کی حمایت کا سلسلہ جاری رہے گا دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆☆

نامنی (Nominee)
کی شرعی اور قانونی حیثیت

محمد انور نظامی مصباحی

> اس موضوع پر مزید تحقیق اور رائے زنی کے لیے اشرفیہ کے صفحات حاضر ہیں۔ مبارک حسین مصباحی

بیمہ کمپنیوں، بینکوں اور دیگر مالی اداروں میں رقم جمع کرنے والوں کو یہ سہولت فراہم کی جاتی ہے کہ کھاتا کھلواتے وقت یا بعد میں کسی شخص یا اشخاص کو جو کھاتا دار یا پالیسی ہولڈر کی موت کی صورت میں رقم وصول کر سکیں، نام زد کریں۔ ایسا شخص یا اشخاص نامنی (Nominee) کہلاتا ہے۔ فارم میں **اس کا** ایک خانہ ہوتا ہے جہاں ایسے نام درج کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

رقم جمع کرنے والے کی موت کے بعد نامنی کی قانونی اور شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ پوری رقم کا تنہا مالک ہو جاتا ہے؟ اور دوسرے ورثہ محروم ہو جائیں گے؟ بہت سے نامنی یا نام زد افراد اسے خاص اپنا حق سمجھ کر دوسرے ورثہ کو کچھ بھی نہیں دیتے۔ لہٰذا نامنی کی شرعی اور قانونی حیثیت سے متعلق قدرے وضاحت پیش ہے۔

نامنی کی قانونی حیثیت:- انشورنس ایکٹ ۱۹۳۸/ دفعہ ۳۹/ کے مطابق کوئی بھی پالیسی ہولڈر پالیسی کی میعاد کے درمیان اپنی موت کی صورت میں پالیسی کی رقم وصول کرنے کے لیے کسی کو بھی نام زد کر سکتا ہے۔

سپریم کورٹ آف انڈیا کے میگزین AIR SUPREMCOURT سن ۱۹۸۴، ص: ۳۴۶/ میں ہے:

Section-39-(1)

The holder of a policy of life insurance on his own life may, when effecting the policy or at any time before the policy matures for payment, nominate the person or persons to whom the money secured by the policy shall be paid in the event of his death.

ترجمہ:- لائف انشورنس کا کوئی بھی پالیسی ہولڈر پالیسی لیتے وقت یا پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے کسی بھی فرد یا افراد کو نام زد کر سکتا ہے، جسے پالیسی کی رقم پالیسی ہولڈر کی موت کی صورت میں ادا کی جائے گی۔

اس قانون کی تشریح میں کورٹ نے نامنی کو رقم وصول کرنے والا محض ایک نمائندہ قرار دیا ہے نہ کہ اس رقم کا مالک۔

(1) - The nominee under section 39 of the act is nothing more than an agent to receive the money due under a life insurance policy .... and the money remains the property of the assured during his life time and on his death forms part of his estate subject to the law of succession applicable to him. (AIR S.C. 348-1984)

ترجمہ:- اس قانون کی دفعہ ۳۹/ کے مطابق نامنی لائف انشورنس پالیسی کی جمع شدہ رقم وصول کرنے والے نمائندے سے زیادہ کچھ نہیں۔ رقم بیمہ ہولڈر کی زندگی میں اس کی ایک جائداد ہوتی ہے اور اس کی موت کے بعد اس کا ترکہ۔ اس میں قانونِ وراثت جاری ہو گا۔

(2) - The nomination only indicates the hand which is outhorised to receive the amount .... the amount however, can be claimed by the heirs of assured in accordance with the law of succession governing them.

(AIR S.C. 352)

ترجمہ:- نامنیشن صرف یہ واضح کرتا ہے کہ کون سا شخص رقم وصول کرنے کا مجاز ہے .... بہر حال قانونِ وراثت کے مطابق ورثہ کو جو حقوق دیے گئے ہیں اس کے

مطابق رقم پر سب کا حق دعویٰ بنتا ہے۔

(3) - The provision in sub section (6) of section 39 which says that the amount shall be payable to the nominee or nominees, does not mean that the amount shall be long to the nominee or nominees.

(AIR S.C. 1984-349)

ترجمہ:- دفعہ ۳۹/ کے ضمنی دفعہ (۶) میں جو نامنیشن کی سہولت دی گئی ہے وہ بتاتا ہے کہ رقم نام زد فرد یا افراد کو ادا کی جائے گی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ نامنی اس کے مالک ہو جائیں گے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ نام زد فرد (Nominee) کی قانونی حیثیت ایک ایجنٹ، محصل اور وصول کنندہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ پالیسی ہولڈر کی موت کے بعد وہ شخص رقم وصول کر سکتا ہے، اس کا مالک نہیں بن جاتا۔ مال میت کا ترکہ قرار پاتا ہے جو قانونِ وراثت کے مطابق ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

نامنی کی شرعی حیثیت:- شرعی نقطۂ نظر سے نامنیشن یعنی نام زدگی نہ تو وصیت ہے نہ ہی تملیک بلکہ یہ "وَصَایَت" ہے اور نام زد فرد (نامنی) وَصی۔

وَصَایَت:- کسی فرد کو اپنے مال کی بعدِ موت نگرانی اور اسے مستحقین تک پہنچانے کے لیے اپنے نمائندہ بعد الموت کے طور پر مقرر کرنے کو وصایت کہتے ہیں ـــــ وصایت، وکالت ہی کی طرح ہے کہ جس طرح کے تصرفات موصی اپنی حیات میں کر سکتا ہے وہ وکالت اور "وصایت" کے ذریعہ وکیل اور وصی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وکالت موکل کی حیات میں تصرف کے لیے ہوتی ہے اور وصایت، موصی کی موت کے بعد۔

حاصل یہ کہ وکالت، نیابت ہے اور وَصَایَت، خلافت۔ وکالت، حالتِ حیات میں ہوتی ہے اور وَصَایت بعدِ موت کے لیے۔

"ہدایہ" میں ہے:

"لان الوصاية خلافة لانه يختص بحال انقطاع ولاية المنيب فتنقل الولاية اليه . . . . . . اما التوكيل اِنابةٌ لثبوته فی حال قيام ولاية المنيب ."

(ہدایہ ۴/ ۲۷۵ باب الوصی، مجلس برکات، مبارک پور)

ترجمہ:- وصایت خلافت ہے کیوں کہ وہ میت کی ولایت ختم ہونے کے وقت سے مختص ہے، لہٰذا ولایت وصی کی طرف منتقل ہو جائے گی .... اور وکالت نیابت ہے، کیوں کہ منیب (نائب بنانے والے) کی ولایت باقی رہتے اس کا ثبوت ہوتا ہے۔

"تکملہ فتح القدیر" میں ہے:

"ان معنى الايصاء الى احد استخلافه بعد الموت لا فی حياته على التصرف الحاصل بعد مماته ."

(تکملہ فتح القدیر ۱۰/ ۵۳۰)

ترجمہ:- کسی کو وصی بنانے کا معنی یہ ہے کہ اپنی موت کے بعد کے تصرفات کے لیے اپنی خلافت سونپنا نہ کہ حیات کے لیے۔

"عنایہ شرح ہدایہ" میں ہے:

"قوله (بخلاف الوكيل) لان التوكيل انابة لثبوته فی حال قيام ولاية الموكل اما الايصاء فخلافة لانه يختص بحال انقطاع ولاية الميت ."

(عناية بهامش الفتح ۱۰/ ۵۳۰)

ترجمہ:- توکیل وکیل کی ولایت باقی رہتے ہوئے ثابت ہوتی ہے مگر وصایت خلافت ہے، کیوں کہ وہ میت کی ولایت ختم ہونے کے ساتھ مختص ہے۔

"فتاویٰ رضویہ" میں ہے:

"وصایت مثل وکالت دوسرے کو اپنی جگہ قائم کرنا ہے، بلکہ وصایت عین وکالت ہے، فرق اس قدر کہ وکالت حیات میں ہوتی ہے اور وصایت بعدِ موت۔"

(فتاویٰ رضویہ ۱۰/ ۲۱۶ رضا اکیڈمی، ممبئی)

خلاصہ یہ کہ نامنی (Nominee) شرعاً وصی ہے۔ نام زدگی رقم کی وصولی میں سہولت کے لیے ہوتی ہے۔ نامنی اس رقم کا مالک نہیں ہو جاتا۔ نامنی کی ذمہ داری ہے کہ رقم وصول کر کے ترکہ کے جو حقوق و احکامات ہیں ان پر عمل کرے۔ نامنیشن کی وجہ سے دیگر ورثہ محروم نہیں ہوں گے۔ نامنیشن میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆

فکرِ امروز

پہلی قسط

جدیدعلمِ کلام

مولانا محمد اسحاق مصباحی

الحمد لله رب العلمين والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين۔ امابعد۔

فکرِ امروز کے قارئین کسی سنجیدہ تحریر کے منتظر ہوں گے۔ لہٰذا اس سلسلے میں ان کو انشاء اللہ سکون و وقار کا ماحول ملے گا۔ اس سلسلے کو معرضِ تحریر میں لانے کی وجہ چند واقعات ہیں۔

[۱] کچھ دنوں سے جدید و قدیم اسلام کی اصطلاح بنالی گئی ہے۔

[۲] وجہِ نجات تمام ادیان و مذاہب ہیں، اس کا ذکر عموماً کیا جارہا ہے۔

[۳] اسلام کی تعلیم: لا اکراہ فی الدین۔ لکم دینکم ولی دین۔ کا مطلب یہ لیا جارہا ہے کہ کفر و اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔

[۴] دیوبند سے گلے کی حرمت کا فتویٰ جاری ہوگیا ہے۔

[۵] سائنسی نظریات کی بنیاد پر اس قدر جرأت سے اسلامی احکام خاص کر قرآن کی آیتوں کی تشریح کی جارہی ہے کہ اس کا اصل مقصد مسخ ہورہا ہے۔

[۶] اسلامی دنیا میں ایک اعتذار پیش کرنے کی لہر چل پڑی ہے۔ یہی لہر جو کبھی سائنسی ترقی کی ابتدا تھی، اسلامی عقائد کے تعلق سے چلی تھی۔

ان حالات میں ہمارا فرض ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کی وہی شرح کریں جو ہمارے اسلاف کرتے آئے ہیں۔ اس تحریر میں ہم اس بات کو خاص طور سے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ عقلیت پسندی کی بنیاد پر عقائد و اسلام کی تشریح اسلام کی روح کے خلاف ہے اور جن لوگوں نے ایسا کیا ان کی تفسیر کو خود ہی ان کے طریقے پر چلنے والوں نے غلط ثابت کردیا۔ لہٰذا عقائد اور کتاب و سنت کی وہی تشریح قابلِ قبول ہے جو جمہور امتِ مسلمہ نے اختیار کی ہے۔

سب سے پہلے ہم اسلامی علمِ کلام کی مختصر تاریخی صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔

دنیا میں عقائد کی بنیاد پر مذاہب تین ہیں:

[۱] منکرین کے نظریات جو حساب و کتاب اور انبیا کی بعثت وغیرہ کا انکار کرتے ہیں۔

[۲] اہلِ کتاب۔ جو لوگ آسمانی کتابوں پر اپنے مذہب کی بنیاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

[۳] کشفِ قلبی کی بنیاد پر علم حاصل ہونے کے بعد مذہب بننے والے نظریات۔

قرآن پاک جس ماحول میں نازل ہوا، وہاں پر پہلے دونوں نظریات والے لوگ موجود تھے، لہٰذا ان کے نظریات کی تفصیل اور رد و اثبات اس کے اندر موجود ہے، باقی کا رد و اثبات بھی موجود ہے مگر وہ اس کے ضمن میں ہی ہے۔

قرآن اور سنت میں عقائد اور اعمال کا بیان ایک توازن اور تناسب سے ہے۔ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ پاک کے بعد اسلامی سلطنت وسیع ہوتی گئی تو اسلام کی تشریح اور دعویٰ کے ساتھ مختلف فرقے وجود میں آئے۔ ابتدا میں یہ اختلاف جزئیاتِ فقہ میں تھا اور بعد میں اس کا دائرہ عقائد کی تفصیل تک جا پہنچا۔ اور اختلاف کی بنیاد چند چیزوں پر تھی۔

(۱)- ابتداءً صحابہ اور تابعین میں اجتہادی اختلاف، اس پر کسی کی تفسیق اور تکفیر نہیں ہوتی تھی۔

جب یہ اختلاف مشہور ہوا تو کچھ ایسے لوگوں نے جن کے دل اسلامی عقائد و تہذیب کو مکمل قبول نہیں کرپائے تھے، اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر اس کو عقائد کے اختلاف میں تبدیل کردیا۔

اس کے لیے مجوسی فارس سے اور یہودی عرب سے سب سے پہلے لوگ تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسل پاک سے محبت کے جذبات کا استحصال کرتے ہوئے "گروہِ شیعہ" وجود میں آیا اور اس کے ردِ عمل میں خارجی و ناجی گروہ مشہور ہوا اور یہودیوں کی علمی قوت سے جبریہ،

شیخ الحدیث جامعہ رضویہ، کیمری، ضلع رام پور

قدریہ، اہل تشبیہ و تعطیل کے نظریات ظاہر ہوئے۔

یہ سلسلہ ۱۵۰ھ تک خوب عام ہوگیا اور ان فرقوں کا لٹریچر مرتب ہوگیا۔ اہل سنت نے ان نظریات کا جواب فتاویٰ اور حدیث و تفسیر کے ذریعہ ہی دیا، کیوں کہ وہ کثرت میں تھے، اس لیے ان کو اتنا زیادہ لٹریچر مرتب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فقہ و حدیث کی علمی و تعلیمی محفلیں کافی تھیں۔

دوسری صدی کے شروع سے منطق و فلسفہ کچھ نہ کچھ عربی میں منتقل ہونا شروع ہوا۔ اس سے پہلے یہودی علم کلام موجود تھا۔ فلسفہ اور یہودی علم کلام کی تشریح کے ساتھ ایک گروہ ظاہر ہوا۔ اس کا نام تھا "معتزلہ"۔ اس گروہ نے تیسری صدی کے وسط تک خوب ترقی کرلی تھی اور اپنے نظریات کو منظم کرکے ایڈٹ کرلیا تھا۔ چوں کہ اس گروہ نے اپنے نظریات کو فلسفہ اور یہودی علم کلام پر قائم کیا تھا اور ان کے اس علم کو "علم کلام" کہا جاتا تھا۔ اس لیے اس وقت تک علم کلام کو گم راہی کا ذریعہ سمجھا گیا۔ پھر اس کے مقابل میں اہل سنت نے ایسا مواد مرتب کیا اور معتزلہ وغیرہ کا رد کیا تو علمِ کلام کے دو مکتبِ فکر معرضِ وجود میں آگئے۔

اس زمانے میں یونانی فلسفہ بھی مکمل عربی میں منتقل ہوچکا تھا اور اس کے بہت سے مسائل بھی ظاہر یا حقیقت میں عقائد اسلام سے متصادم ہورہے تھے۔ لہٰذا علماے اہل سنت نے ان کا بھی رد شروع کردیا، جس سے علم کلام کا دامن بہت وسیع ہوگیا اور اس کا موضوع بھی تبدیل ہوگیا اور اس کا دائرہ مندرجہ ذیل مباحث پر مشتمل ہوگیا۔

[۱] اسلامی فرقوں کا رد اور ان کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل سنت کا اثبات۔

[۲] فلسفہ کا رد اور اس کے مقابلہ میں اسلامی عقیدہ کا اثبات۔

[۳] تمام اسلامی عقائد کا عقلاً اثبات۔

[۴] علمیات کے مباحث۔

اور یہ سلسلہ آٹھویں صدی ہجری تک ترقی کرتا رہا چوتھی صدی سے اکثر وہ علما اس میدان میں اترے جو فلسفہ اور شرعیات کے ماہر تھے۔ اس بنیاد پر اس دور میں فلسفہ اور عقیدہ میں ٹکراؤ کے بیان اور دلائل کے ساتھ ساتھ زیادہ کوشش دونوں میں تطبیق پر کی گئی۔

نویں صدی کے بعد علم کلام پر زوال رہا اور قدیم کتب پر اعتماد جاری رہا۔ ان کی تعلیم کو ہی انتہا سمجھا گیا۔

یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کا زمانہ شروع ہوا اور جدید سائنس نے اپنے نظریات عام کیے۔ اس وقت علماے اسلام میں تین گروہ ظاہر ہوئے۔

[۱] ایک تو وہ گروہ جس نے سائنسی نظریات کو سرے سے رد کردیا اور قدیم یونانی فلسفہ ہی کو مانا، جیسا کہ انھوں نے عقیدہ کو باقی رکھا۔

[۲] دوسرا وہ گروہ جو محققین اہل سنت کا تھا، جنھوں نے جدید سائنس کو قدیم فلسفہ کی طرح چھان بین کرکے صرف انھیں نظریات کا رد کیا جو اسلامی عقیدے سے حقیقت میں ٹکراتے تھے۔ ان علما میں سرفہرست امام احمد رضا بریلوی ہیں۔

[۳] تیسرا وہ گروہ جس نے سائنس کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور تمام اسلامی عقائد اور کتاب و سنت کی ایسی تشریح کرڈالی جو سائنس کو راضی کرلے۔ اگرچہ وہ تمام علماے حق اور کتاب و سنت کے خلاف ہو، ان میں سرفہرست "سرسید" بانی علی گڑھ یونیورسٹی تھے۔

پہلا گروہ جدید سائنس سے ٹکراؤ میں اتنا بڑھ گیا کہ اس نے ریل وغیرہ کے سفر کا ہی مذاق اڑانا شروع کردیا اور جدید ترقی کے سامان کے خلاف ہی فتوے دے دیے۔ اور تیسرا گروہ بھی اس قدر مغرب کا مدح سرا ہوا اور اس کی تہذیب و عقائد و علوم کو بغیر چھان بین کے قبول کرلیا کہ اسلامی عقائد مثلاً حشر و نشر، وجودِ ملائکہ، اور جن کا ایسا مطلب بیان کردیا کہ اس میں کتاب اللہ کی صریح آیتوں کا انکار تھا— یہاں پر ایک گروہ وہ بھی تھا جو مغربی طرزِ معیشت کو اسلامی احکام پر مکمل ترجیح دیتا تھا اور سود وغیرہ کی حلت کا قائل ہوگیا۔

اگرچہ اول و ثالث گروہ کا رد اس وقت متوازن فکر رکھنے والے گروہ یعنی اہل سنت نے اپنی بساط بھر کردیا اور وہ مواد آج بھی موجود ہے۔ تمام دنیا میں عقیدۂ اسلامی کا نور اس سے جگ مگ ہے۔

مگر خود جدید علم نے ان لوگوں کی جہالت اور کم علمی کو ظاہر کردیا، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا موجودہ وقت کا مسلمان بھی اس سے واقف ہو کہ جدید علم نے علماے اہل سنت کے موقف کی تائید کردی ہے اور اہل سنت کے عقیدے کی بلندی و درستی ثابت کردی ہے۔

علم کلام کی مشہور کتابیں:-

[۱] رد اهل الاهواء البدع مصنف : الامام ابو الحسن الطرائفی الشافعی ۳۷۷ھ.

[۲] کتاب الرد علی الزنادقة والجهمیة للامام احمد بن محمد بن حنبل.

[۳] شرح الفقه الاکبر للامام ابو منصور الماتریدی.

[٤] کتاب تاویلات القرآن للامام ابو منصور الماتریدی.

[٥] کتاب التوحید للامام ابو منصور الماتریدی.

[٦] کتاب المقالات للامام ابو منصور الماتریدی.

[٧] کتاب بیان اوهام المعتزله للامام ابو منصور الماتریدی.

[٨] عقیدة الطحاوی و بیان السنة للامام الطحاوی.

[٩] کتاب الشامل فی الاعتقاد لابی المعالی امام الحرمین.

[١٠] المنقذ من الضلال للامام الغزالی.

[١١] خلاصة الارشاد للامام الغزالی.

[١٢] تهافة الفلاسفة للامام الغزالی.

[١٣] الاقتصاد للامام الغزالی.

[١٤] قواعد القواعد للامام الغزالی.

[١٥] العقائد النسفیة للامام نجم الدین ابی حفص عمر بن محمد، ۵۳۷ھ.

[١٦] شرح العقائد النسفیة للامام سعد الدین التفتازانی.

[١٧] کتاب المسامرة للامام العلامه اکمال بن الهمام الحنفی، ۸۶۱ھ.

[١٨] شرح المسامرة باسم المساهره لکمال الدین محمد بن ابی شریف المقدسی، ۹۰۵ھ.

[١٩] طوالع الانوار للامام ناصر الدین القاضی البیضاوی ۶۸۵ھ.

[٢٠] تجرید العقائد للامام المحقق الطوسی الشیعی، ۶۷۲ھ.

[٢١] المواقف فی الکلام للقاضی عضد الدین

[٢٢] شرح المواقف للعلامه شریف الجرجانی.

[٢٣] العقائد العضدیة للقاضی عضد الدین.

[٢٤] شرح العقائد العضدیة للمحقق الدوانی

[٢٥] المقاصد و شرح المقاصد للتفتازانی.

[٢٦] منح الروض الازهر شرح الفقه الاکبر.

[٢٧] شرح الفقه الاکبر باسم القول الفصل.

[٢٨] المعتقد المنتقد للعلامه فضل رسول ۱۲۸۹ھ.

[٢٩] المستند المعتمد بناء نجا الأبد للامام احمد رضا، ۱۳۴۰ھ.

اس کے علاوہ امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ نے ۳۰۰/ کتابیں علم عقائد میں تحریر فرمائیں جن میں ان تمام مذاہبِ باطلہ کا رد ہے جن کے فتنے نے دین کو نقصان پہنچانا چاہا اور تقریباً ۵۰۰/ کتابیں علمائے اہلِ سنت نے مذاہبِ زائغہ کے رد میں تحریر فرمائی ہیں، جن میں امام احمد رضا فاضل بریلوی کے خلفا بھی شامل ہیں۔

ہم نے یہاں علم کلام پر علمائے اہلِ سنت کی مشہور کتابوں کا ذکر کیا ہے، ورنہ علم عقائد پر صرف عربی فارسی اور اردو میں ۷/ ہزار سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی تصانیف کے لیے الگ رسائل بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

حضرت علی و حضرت معاویہ کے درمیان معرکہ میں جو لوگ غیر جانب دار تھے ان کو بھی قدیم عربی تاریخ میں معتزلہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب حضرت حسن نے حضرت معاویہ کے حق میں بیعت فرمائی تو اس وقت جو لوگ حضرت محمد بن حنفیہ کی قیادت میں سیاست سے الگ ہو کر علمی کاموں اور عبادات میں مشغول ہوئے ان کو بھی معتزلہ کہا جاتا ہے، مگر ان پر معتزلہ کا لقب لغۃً بولا گیا ہے۔ یہ دونوں گروہ تابعین وصحابہ کی طرح حق پر ہیں۔

جس فرقے کو ہم لوگ معتزلہ فی العقائد کہتے ہیں، یہ وہ گروہ ہے جو واصل بن عطا کی فکر کی بنا پر مشہور ہوا اور جن کے نظریات اہلِ سنت سے ٹکراتے تھے۔ واصل بن عطا شاگرد تھا ابو ہاشم عبد اللہ کا اور وہ شاگرد تھے اپنے والد محمد بن حنفیہ کے۔ حضرت ابو ہاشم اور حضرت محمد حنفیہ سے واصل بن عطا نے تعلیم ضرور حاصل کی تھی مگر اس نے ان دونوں بزرگوں کا طریقہ چھوڑ دیا اور ان کے برخلاف صحابہ کے اختلافات کی بنیاد پر ان کی تفسیق کرتا تھا۔ بلکہ اس پر اصل اثر جعد بن درہم کا تھا جو شاگرد تھا جہم بن صفوان کا۔ ان دونوں پر اثر تھا یہودی فلسفہ وکلام کا جس کا آخری پڑاؤ علاقۂ خران تھا۔ یونانی منطق اور فلسفہ کے اثر سے یہودی نفیِ صفات اور اللہ تعالیٰ کی تعطیل کے قائل ہو گئے تھے۔ اور منطق و فلسفہ اور عقائد کو اس پر پرکھنے کی وجہ سے یہ لوگ عقائد حقہ سے پھر گئے تھے اور یہ وہی چیز تھی جس کی بنیاد پر معتزلہ کا یہ خطرناک گروہ نمودار ہوا۔ اصل میں انسانوں کی فکر مرحلہ وار کائنات کے راز کھول رہی ہے، جس میں اول، دوسرے مرحلہ کے لیے ممد و معاون ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اس عالمِ ممکنات سے نہیں ہے۔ لہٰذا عقائد کو صرف عقل پر پرکھ کر باقی نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ وہاں پر رسولانِ عظام کی تعلیم پر ہی قناعت کرنی ہو گی اور حریمِ ذات وصفات میں عقل کو پس پردہ ڈالنا ہی ہو گا۔

ہم اس مقالہ کی چند قسطوں میں یہی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ صرف سائنس اور فلسفہ پر عقائد کو نہیں پرکھا جاسکتا ہے، بلکہ عقائد میں اصل کتاب وسنت کی تعلیم ہی ہے۔ (باقی، ص: ۱۶/ پر)

شعاعیں

دینی تعلیمی نصاب اور طریقۂ تعلیم میں تبدیلی

ضرورت اور اہمیت

علامہ محمد احمد مصباحی

امتِ مسلمہ کے ترجیحی مسائل اور ان کے حل پر دوسری کل ہند فکر وتدبیر کانفرنس ۸۳ ویں عرسِ قاسمی کے موقع پر خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے زیرِ انتظام بہ عنوان ''مسلم معاشرے میں تعلیم: مسائل اور امکانات'' ۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۷/ نومبر ۲۰۰۹ء سنیچر کو دن میں ایک بجے سے سوا پانچ بجے تک منعقد ہوئی۔ جامعہ اشرفیہ کے پرنسپل حضرت علامہ محمد احمد مصباحی صاحب نے مندرجہ ذیل فکر انگیز تحریر اسی کانفرنس میں پیش فرمائی تھی۔ افادۂ عام کے لیے نظرِ قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم حامداً و مصلیاً

دینی تعلیم کے کئی مراحل ہیں۔ ایک مرحلہ یہ ہے کہ ابتدا میں بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن کریم پڑھا دیا جائے۔ وضو ونماز کے ضروری مسائل اور دعائیں سکھا کر ان کی عملی مشق کرائی جائے، اور پابندی نماز کی عادت پیدا کی جائے۔ پھر اردو زبان سکھا کر اردو کتابوں کے ذریعہ عقائد واخلاق اور عبادات ومعاملات کے ضروری اور عام مسائل کی تعلیم دی جائے ـــ اس مرحلے کے لیے نصاب ایسا ہونا چاہیے جو بچوں کی طبیعت اور مزاج سے قریب تر، بہت آسان اور دلچسپ ہو۔

دینی تعلیم کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو بعض مسلم اسکولوں اور کالجوں میں اپنایا گیا ہے کہ عصری علوم سکھانے کے ساتھ طلبہ کو دینی تعلیم وتربیت سے روشناس کیا جائے۔ اس شعبے کے لیے بچوں کی عمر کی لحاظ سے نصاب ذرا مشکل تو ہوسکتا ہے لیکن مختصر اور جامع ہونا بہت ضروری ہے تاکہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ اسلامی عقائد و مسائل، اسلامی تاریخ اور اہم دینی شخصیات سے بھی آگاہی ہو سکے اور طلبہ دوسرے ماحول میں جا کر بھی اپنے دین، دینی معاشرہ اور دینی عقیدہ وعمل سے دور نہ ہو سکیں اور بد مذہبوں، بے دینوں کی یلغار سے بھی اپنے کو بچا سکیں۔

لیکن اس کانفرنس میں مجھے جو عنوان دیا گیا ہے اس کا اصل مطمحِ نظر غالباً وہ دینی تعلیمی نصاب ہے جو مدارس دینیہ عالیہ میں علمائے دین کی تخریج کے لیے مقرر ہے۔

اس نصاب کا بنیادی اور اہم مقصد یہ ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے اور ان سے براہِ راست استفادہ کی صلاحیت پیدا ہو، اسلامی عقائد واحکام کا عرفان ان کے دلائل کے ساتھ ہو، اسلامی مآخذ، اسلامی تاریخ، سیرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، شعائر اسلام، اور اہل سنت کے عقائد ومعمولات پر غیروں کی جانب سے ہونے والے حملوں کا جواب دینے کی قوت پیدا ہو اور مختلف محاذوں پر امت مسلمہ کی حکیمانہ ومخلصانہ رہنمائی اور رہبری کی لیاقت بہم ہو۔

میں نے چند جملوں میں جن باتوں کو سمیٹ دیا ہے جب آپ ان کی گہرائی میں اتریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ دینی تعلیمی نصاب نہایت اہم، بہت مشکل، بڑا صبر آزما اور حد درجہ مشقت خیز ہے۔ مزید برآں اس کے ساتھ کسی بڑی مادی منفعت کی توقع بھی وابستہ نہیں۔

آج عصری درس گاہوں نے اپنے علوم وفنون کو اقسام در اقسام تقسیم کر کے اپنا ہر نصاب بہت آسان اور مختصر بنا لیا ہے، اور ایک شعبے کو اختیار کرنے والا اگر دوسرے شعبے کی معلومات سے یکسر خالی ہوتا ہے تو یہ اس کے لیے کوئی عار کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن دینی عالم سے یہ توقع رکھی جاتی ہے بلکہ اس کے لیے یہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمام دینی علوم وفنون میں ماہر کامل ہونے کے ساتھ ریاضی، سائنس، جغرافیہ، تاریخِ عالم وغیرہ اور دنیا کی مشہور زبانوں کا بھی شناور ہو۔

دوسری طرف مدارس کا جائزہ لیجیے تو اکثر زبوں حالی کا شکار

ہیں۔ ان کے لیے جیسے تیسے ادارہ چلانا ہی دوبھر ہے۔ خصوصاً نصاب تعلیم پر غور وخوض اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کے مطابق نصابی کتابیں تیار کرنے کا ان کے پاس کوئی باضابطہ انتظام نہیں۔ حال ہمارے سامنے ہے اور ماضی قریب بھی اس سے مختلف نہیں۔ ہاں ماضی بعید میں جایئے تو بہت سی تبدیلیاں اور بہت سی کاوشیں نظر آئیں گی، لیکن وہ بھی اجتماعی اور ہمہ جہت نہیں، بلکہ چند مخلص اور متبحر علما کی ذاتی وانفرادی کاوشیں ہیں جو انھوں نے اپنے علمی رسوخ واستحضار اور ذاتی ذوق ورجحان کی بنا پر بہت آسانی سے اور بہت کم مدت میں انجام دیں، اور انھیں بہت سے خطوں میں قبول عام بھی حاصل ہو گیا۔

جب کہ اس وقت دنیا کا یہ حال ہے کہ خود حکومتوں کے تحت وزارت تعلیم کا شعبہ ہوتا ہے جس میں کچھ ماہرین بھاری تنخواہوں پر اسی کام کے لیے مختص ہوتے ہیں کہ نصاب کا جائزہ لیتے رہیں اور حسب ضرورت ترمیم کرکے نیا نصاب سامنے لاتے رہیں، اب یہ ان کی ڈیوٹی بن چکی ہے کہ ہر سال نہیں تو کم از کم پانچ سال میں نصابی کتب میں کچھ ترمیم ضرور کریں ورنہ نصاب بورڈ ناکارہ ونااہل قرار پائے گا۔ ہمارا ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر برصغیر کے مدارس کا حال ساری دنیا سے الگ ہے۔

اولاً: عام مدارس پر نظر ڈالیے تو تعلیم کی عمدگی پر خاطر خواہ توجہ ہی نہیں بس کچھ طلبہ آتے جاتے رہیں، مدرسہ اور مدرسین کا وجود جائز رکھنے کے لیے یہی کافی ہے۔

ثانیاً: جو نصاب جاری ہے اس میں کوئی ترمیم بھی ممکن ہے، یہ ان کے تصور سے بالاتر ہے۔

ثالثاً: نصابی کتابوں اور نصابی فنون کا مقصد کیا ہے۔ عام مدرسین کو اس سے بھی سروکار نہیں۔ کون سا فن، اور کون سی کتاب ناقص ہو تو طالب علم کی اگلی تعلیم کمزور یا بالکل برباد ہو جائے گی اس کا بھی خیال نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی، انتہائی، درمیانی کوئی بھی کتاب ہو اگر اس کے چند صفحات کی زیارت سے طالب علم کو سرفراز کر دیا جائے تو ہمارا فرض پورا ہو گیا۔

رابعاً: ان حالات میں بھی بہت سے اہل علم ایسے ہیں جو تعلیم اور نصاب پر غور کرتے ہیں بلکہ آج سے تیس سال قبل مبارک پور میں تنظیم المدارس اور الٰہ آباد میں رابطۂ مدارس کا قیام عمل میں آیا اور نصاب میں ترمیم کی ضرورت کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ پھر ترمیم شدہ نصاب بھی پیش ہوئے مگر مدارس کے باہمی ارتباط اور یکساں نصاب کے نفاذ کا معاملہ آج تک تشنۂ تکمیل ہے۔ مدارس کی جو عام روش چلی آئی ہے اس میں کوئی خوش گوار تبدیلی شاید وباید ہی نظر آتی ہے۔

اب خانقاہ برکاتیہ کی تحریک پر ۲۰۰۷ء میں تنظیم المدارس کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تو اس کی نصابی نشست میں ترمیم نصاب پر ذرا وسیع پیمانے پر غور وخوض ہوا، پورے قرآن کو درس یا مطالعۂ یا تفسیر کے ساتھ داخل نصاب کیا گیا۔ تصوف جو عرصۂ دراز سے خارج از نصاب تھا اسے بھی نصاب میں جگہ دی گئی، حدیث وفقہ کے درس میں بھی گراں قدر اضافہ کیا گیا۔ بعض فنون جن سے مختصر آشنائی بہت آسان ہے اور بالکل ناواقفی سخت مضر، انھیں بھی بقدر گنجائش شامل نصاب کیا گیا۔ فن تجوید کو بھی لازم کیا گیا۔ انگریزی زبان اور بعض عصری علوم جو جامعہ اشرفیہ کے نصاب میں شامل تھے انھیں بھی برقرار رکھا گیا۔ تفصیل ماہ نامہ اشرفیہ شمارہ جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود اس بار کچھ نصابی کتب خود تیار کرنے اور شائع کرنے کی بھی ہمت کی گئی جب کہ ۸۱-۱۹۸۰ء میں اسے بہت مشکل یا ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔ (دیکھئے رابطۂ مدارس عربیہ الٰہ آباد کی رپورٹ ص:۹) نصابی کتب کی تیاری کا کام مجلس برکات کے سپرد کیا گیا ہے۔ مجلس برکات کا قیام دس بارہ سال قبل حضرت امین ملت (پروفیسر شاہ محمد امین برکاتی) کی سرپرستی میں ہوا ہے۔ اور جامعہ اشرفیہ کے زیر انتظام سرگرم عمل ہے۔ اس کا پورا وجود آستانہ برکات کا فیضان ہے۔

نصاب میں ترمیم کی ضرورت کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر ہمارے معاصرین اور ہمارے اکابر بہت پہلے تسلیم کر چکے ہیں اور پوری دنیا میں اس پر عمل درآمد بھی جاری ہے اور پہلے بھی یہ عمل ہمیشہ جاری رہا ہے۔ ہمارے پر دادا استاد حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری ثم جون پوری اور حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہما الرحمہ کے یہاں جو نصاب رائج تھے وہ بعینہٖ ان کے شاگرد حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کی درس گاہ میں نہ رہے اور ان کی درس گاہ میں جو نصاب تھا وہ بعینہٖ ان کے تلامذہ محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد لائل پوری، حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز

مرادآبادی، صدر العلما مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی، شیخ العلما مولانا غلام جیلانی اعظمی وغیرہم علیہم الرحمہ کی درس گاہوں میں نہ رہا۔ نصاب، معیار داخلہ، معیار فراغت سب میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔

الغرض حسب حالات تبدیلی نصاب ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلاف واخلاف کا عمل خود اس پر شاہد عدل ہے۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ تنظیم المدارس کا نصاب یا کوئی بھی نصاب حرف آخر نہیں۔ اس لیے تنظیم المدارس کے تحت ایک نصاب بورڈ بھی ہوگا، جو طلبہ ومدرسین کی شکایات سننے، حالات کا جائزہ لینے اور نئی ترمیم یا اس کی تجویز سامنے لانے کا ذمہ دار ہوگا۔

ہاں اس بات کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے کہ جو وسائل حکومتوں کے پاس ہیں ان کا سواں حصہ بھی مدارس کے پاس نہیں۔ اسی لیے باتیں تو بہت ہوتی ہیں مگر عمل نہیں ہو پاتا۔

میرے عنوان کا دوسرا جز ہے:

طریقۂ تعلیم میں تبدیلی

اس پر بھی تفصیلی گفتگو ہو سکتی ہے مگر جہاں جمود کا یہ عالم ہو کہ سب کچھ تسلیم ہونے کے باوجود اعضا میں حرکتِ عمل کی آہٹ قریب سے قریب جا کر بھی نہ محسوس ہو وہاں کسی اور تبدیلی کی تجویز بار آور ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

پہلے اساتذہ قواعد یاد کرانے کے بعد زبانی سوالات کے ذریعہ ان کا اجرا کراتے تھے۔ اب عملی مشق اور زبانی وتحریری سوالات کے جوابات لے کر قواعد ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ کوئی بات سمجھانے کے لیے قرطاس وقلم کا سہارا پہلے شاذ ونادر ہی لیا جاتا تھا۔ اب بلا ضرورت بھی تختۂ سیاہ کا استعمال عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ پہلے ششماہی امتحانات کا وجود نہ تھا اور سالانہ امتحانات کے لیے صرف دماغ اور زبان کا استعمال کافی تھا جس کے باعث فعال زبانیں تو بہت پیدا ہوئیں مگر کارآمد ہاتھ کم نکلے۔ اب امتحانات کی کثرت ہے جن میں زبانی امتحانات بہت کم ہیں اور اکثر وہی ہیں جن میں زبان کو ساکن اور ہاتھ کو متحرک رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے فعال ہاتھوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہاتھوں کی زیادہ حرکت بھی دردسر بننے لگی ہے۔

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

پہلے طلبہ کی تعداد کم ہوتی تھی اور استاد انفرادی طور پر ہر طالب علم کو زبانی مشق واجرا کے مراحل سے گزار لیتا تھا۔ اب یہ کام مشکل ہے۔ ہر درس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اساتذہ بھی عموماً تربیت یافتہ (ٹرینڈ) نہیں ہوتے۔ اس لیے اب نصابی کتابیں ہی اس انداز سے تیار کی جاتی ہیں کہ ان میں مشقی سوالات اور تحریری عمل کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ سوالات وتمرینات کے ذریعہ سبق فہمی کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ اور سبق کو مزید سمجھانے اور ذہن نشین کرنے کوشش بھی کی جاتی ہے۔ مزید برآں استاد کچھ باتیں تختۂ سیاہ پر لکھ کر طلبہ کو فوراً سمجھا جاتا ہے۔ پھر دو چار طلبہ کے ذریعہ بلیک بورڈ پر کچھ عمل کراتا ہے۔ اس طرح کمزور طلبہ کے لیے بھی سبق سمجھنا اور ذہن نشین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور بقیہ تمرینی عمل وہ خود کر کے لاتے ہیں، لیکن استاذ نے اگر ہر طالب علم کی کاپی دیکھنے، اس کی کتاب فہمی کا جائزہ لینے اور مناسب ہدایات دینے کی زحمت گوارا نہ کی تو اس طریقۂ درس کی افادیت بہت کم ہو جائے گی۔

فی الجملہ یہ طریقۂ تدریس زیادہ کارگر اور بار آور ثابت ہوا ہے اس لیے مدارس کو بھی اسے اپنانے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جب کہ قدیم اساتذہ کی طرح زبانی مشق واجرا اور کثرت تمرین وتفہیم کا عمل بھی کم تر یا مفقود ہو چکا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مدارس ہوں یا اسکول اور کالج، ان کے اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داران یہ سمجھیں کہ تعلیم بڑی اہم چیز ہے، اس پر توجہ دینا، اس میں نکھار لانا اور متعلقہ فن میں طلبہ کے اندر رسوخ وکمال بہم پہنچانا ہماری منصبی ذمہ داری ہے۔

آخر میں نصاب کے متعلق چند باتیں مزید عرض کرنا چاہتا ہوں، ان پر اگر تمام مدارس کاربند ہوں تو میرے خیال میں نتائج زیادہ اچھے ہو سکتے ہیں۔

(۱) درجۂ پنجم یا ہشتم تک اسکولوں کے مطابق بچوں کو حساب، سائنس، جغرافیہ، ہندی وغیرہ کی تعلیم اردو زبان اور دینیات کے ساتھ باضابطہ دی جائے تا کہ وہ ضروری حد تک اُن علوم سے آشنا ہو جائیں جن کی انھیں زندگی میں قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے اور دین کی بنیادی باتوں سے بھی باخبر ہوں...... (باقی ص:۲۷ رپر)

اسلام اور امنِ عالم

خودکش بموں کا اسلامی جہاد سے کوئی تعلق نہیں

پروفیسر فاروق احمد صدیقی

معاصر دنیا میں مختلف مذاہب وادیان اور نظام ہائے حیات موجود ہیں۔ ان میں صرف مذہبِ اسلام کا یہ امتیاز خاص ہے کہ اس کے معنی میں ہی امن وسلامتی کا مفہوم پنہاں ہے۔ یہ اعزاز وافتخار کسی اور مذہب، دھرم اور طرزِ حیات کو میسر نہیں، اسی طرح مذہبِ اسلام، عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد، محافظ اور قدرداں کی حیثیت سے اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ وہ مذہبِ مہذب جو قرآن کے مطابق ایک آدمی کے قتل کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے اور ایک انسانی زندگی کے بچانے کو پوری انسانی برادری کے تحفظ کے برابر سمجھتا ہے۔ اسلام کے سایۂ کرم میں کسی فتنے، سازش، شورش اور اضطراب کے پنپنے یا پروان چڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر برا ہو اسلام دشمنی، تعصب اور تنگ نظری کا کہ کسی خطۂ ارض میں کوئی فساد رونما ہو تو وہ اسلام اور مسلمانوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ پھر الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ زوردار تشہیر کرا کر ذہنوں کو مسموم کیا جاتا ہے اور مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو بار بار دُہرایا جائے تو اس پر صداقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں ماضی قریب کے دو اہم واقعات بلکہ سانحات کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ۱۱/ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے ٹریڈ سینٹر پر ہوئے حملہ میں اُسامہ بن لادن کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا اور آج تک یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ جاری ہے۔ عراق کے سابق صدر مملکت صدام حسین مرحوم پر بہتان تراشی کی گئی کہ اس نے بہت سارے مہلک اسلحے فراہم کر رکھے ہیں جو پوری دنیا کے لیے تباہ کن ثابت ہوں گے، اس لیے اس خطرہ کا تدارک ضروری ہے۔ چناں چہ Might is right (جس کی لاٹھی اس کی بھینس) کے نظریہ کے مطابق صدام حسین کو جرم بے گناہی میں تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا اور عراق میں قتل وخوں ریزی کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ جب کہ ان دونوں ہی واقعات میں حقیقت وصداقت کا دور دور تک پتہ نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ان الزامات کے دفاع میں جو آواز بلند کی جاتی ہے وہ اتنی نحیف وناتواں ہوتی ہے کہ دل سے نکلنے کے باوجود طاقتِ پرواز نہیں رکھتی۔ اس کا اہم سبب ذرائعِ ابلاغ پر ہماری عدم دسترس، مسلم ملکوں کی تن آسانی وتعیش پسندی اور عاقبت نااندیشی کے علاوہ اور کیا کہا جائے۔

آج عالمی منظر نامہ پر نظر ڈالیے تو اسلام اور مسلمان چوطرفہ حملوں کی زد میں ہیں۔ قرآن مقدس کی وہ آیات جو عدل وانصاف، صلح وآشتی، اخوت ومحبت، ہمدردی وغم خواری اور عفو ودرگزر کی تعلیمات دے رہی ہیں، ان کو شعوری طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ پھر سیاق وسباق سے الگ کرکے ان کا مفہوم توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کو امنِ عالم کا مخالف ثابت کیا جاسکے۔

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

اسلام کی انصاف پسندی اور عدل گستری کے سلسلے میں قرآن پاک کا یہ چشم کشا اعلان ملاحظہ ہو:

"تمھیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تو انصاف نہ کرسکو۔" (پ:۶، سورۂ مائدہ، آیت: ۳۲)

پھر دوسرے مقام پر ہے:

"اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہو اور خوشنودیِ مولا کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، چاہے اس میں تمہارا اپنا نقصان ہو یا ماں باپ کا یا رشتے دار کا، جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر، وہ اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔" (پ:۵، سورۂ نساء، آیت: ۱۳۵)

سورۂ حجر میں کہا گیا ہے:

"اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اس کے سنورنے کے بعد اور اس سے دعا کرو اس سے ڈرتے اور طمع کرتے، بے شک اللہ کی رحمت نیک لوگوں سے قریب ہے۔" (آیت: ۸۸)

سورہ مومنون میں یہ تعلیم دی گئی:

"اور اے مسلمانو! کتابیوں سے نہ جھگڑو مگر بہتر طریقے پر، مگر وہ جنھوں نے ان پر ظلم کیا۔" (آیت: ۹۴)

سورہ توبہ میں آیا ہے:

"اور اے محبوب کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔" (آیت: ۹۴)

یہاں امن وانصاف سے متعلق قرآن کی ساری آیتوں کا ادراک واحاطہ کرنا مقصود نہیں ہے، صرف نمونہ کے طور پر چند آیتیں زیرِ بحث لائی گئی ہیں جن سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے تمام اقوامِ عالم کے ساتھ کس طرح عادلانہ سلوک کرنے اور محبت ورواداری کا مظاہرہ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ لیکن

ع آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے

آج اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کردارکشی کی جو منصوبہ بند مہم جاری ہے اس میں سب سے بڑا اور سنگین الزام "دہشت گردی" سے متعلق ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ دہشت گردی کی اصطلاح مغربی سیاست کی وضع کردہ ہے۔ ظالموں نے ہمیشہ مظلوموں کی دفاع کی کوشش کو جرم قرار دیا ہے اور عہدِ حاضر میں اس کو دہشت گردی کا نام دیا ہے۔ آج امریکہ اور اس کی پشت پناہی میں صیہونی عزائم کم زور انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ طاغوتی طاقتیں متحد ہو رہی ہیں، ان میں امریکہ، یورپ اور ہندوستان کے فرقہ پرست سب برابر کے شریک ہیں۔ اگر حریت پسندی یا اپنی بقا اور اپنے تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا دہشت گردی ہے تو یہ ظالموں کی ریشہ دوانیوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر مغربی طاقتیں من مانی کرنا چھوڑ دیں اور دوسروں کو جینے کا برابر کا حق دیں تو دہشت گردی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

لیکن اسلام دشمن طاقتیں اپنی روش نہیں بدلیں گی۔ اس کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ تو وہی ہے جس کی نشان دہی خود خدائے علیم وخبیر نے آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے کردی تھی کہ:

"وَلَن تَرْضٰی عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔" (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۲۰)

یہود ونصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

اور دوسری وجہ کی پیشین گوئی شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے آج سے تقریباً پون صدی پیش تر کردی تھی۔ "ارمغانِ حجاز" اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس کی ایک اہم نظم ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس میں اقبال نے شیطانی پارلیمنٹ کا ایک خیالی نقشہ پیش کیا ہے جس میں دنیا بھر کے ابلیسی نظام کے اہم نمائندے شریک ہوتے ہیں جو اس وقت کے مروجہ نظاموں، سرمایہ داری، جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور اسلامی نظامِ حیات کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "دنیا میں ملتِ اسلامیہ ہی اس کے شیطانی نظام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس لیے مصلحت اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی تمام طاقتیں اسی دشمن نمبر ون کے مقابلے پر لگادی جائیں اور اگر اسے ختم نہ کیا جاسکے تب بھی اس کا زور توڑ دیا جائے یا اس پر غفلت کی نیند ہی طاری کردی جائے۔"

اور آج یہی ہو رہا ہے۔ کیا یہ سراسر حقیقت نہیں ہے کہ مسلم ممالک کو مرعوب ومغلوب رکھنے کے لیے نئے نئے حیلے تراشے جارہے ہیں جن میں تحریص وتہدید کا آزمودہ نسخہ بھی شامل ہے جس کا شکار ہمارا حکمراں طبقہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس لیے اپنے کردار واعمال کے محاسبے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک موقع پر رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے جاں نثاروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"تم پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب دنیا کی تمام قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح دستر خوان پر بھوکے ٹوٹ پڑتے ہیں۔" صحابۂ کرام نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا اس وقت ہم لوگ تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، تعداد میں تو تم بہت ہوگے لیکن تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت ختم کردی جائے گی اور تمہارے دلوں میں کمزوریاں ڈال دی جائیں گی۔ دریافت کیا گیا، یارسول اللہ ﷺ! کمزوری سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت۔"

اس حدیثِ پاک کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کا جائزہ لے سکتے

ہیں کہ ہم کہاں ہیں؟ یہاں پر اس تلخ حقیقت کا اظہار بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آج بنام اسلام کچھ نادان دوستوں نے خود کش بموں کے ذریعہ اپنی جانوں کو اور بے قصوروں، بے گناہوں کی زندگیوں کو ہلاک کرنے کا جو سفاکانہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کا اسلامی جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی تصور سے کوسوں دور ان کا یہ ذاتی عمل اسلامی جہاد کے مقدس لفظ کو پامال بلکہ بدنام کرنے کے مترادف ہے، ساتھ ہی وہ بالواسطہ اسلام دشمن طاقتوں کی پروپیگنڈہ مشینری کو غذا فراہم کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم نام نہاد فدائین سے اپنی بے زاری کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے تمام مادی اور روحانی وسائل کو بروے کار لا کر اپنی دفاعی قوت کو مستحکم کرنے میں لگ جائیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ۔" (سورۂ انفال، آیت: ۶۰)

اور ان کے (مقابلے کے لیے) تیار رکھو جو قوت تمھیں بن پڑے اور جتنے گھوڑے باندھ سکو اس سے ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ جو اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن ہیں۔ (کنز الایمان)

یعنی سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی ہو۔ امنِ عالم کے قیام کے سلسلے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے دفاعی اقدام عین تقاضاے فطرت ہے۔ اس میں اگر کوتاہی ہوئی تو پھر وہ انجام سامنے ہے جس کا زبردست احساس درج ذیل شعر میں ملتا ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مختصر یہ کہ اسلام یقیناً امن و آشتی کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنے کردار و اعمال کے ذریعے غیر مسلم اقوام کے ذہنوں پر اس کا خوش گوار تاثر قائم کریں تاکہ وہ ہم سے قریب ہوں۔ ہو سکتا ہے اس طرح ان کو اسلام کے دامنِ امن و اماں میں پناہ لینے کی توفیق مل جائے۔ ☆

(ص:۱۰/ کا بقیہ) — فلسفہ اور سائنس خود ان کے آگے جھکیں تو ان کی صحت سمجھو اور اگر کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو جانو کہ ابھی یہ سائنس اور فلسفہ نامکمل ہیں۔

عقل پرستوں سے اہلِ سنت کا اختلاف اس طور ہوا کہ یہ عقل پرست غیر اسلامی رجحانات سے متاثر تھے، جبر و اختیار کے مسئلے میں ان پر یہودی نصرانی تعلیمات اور صفات باری کے تعلق سے یہودی اور نو فلاطونی کا اثر غالب تھا۔ لہٰذا اس عہد کے اہلِ سنت متکلمین نے جہاں ایک جانب زنادقہ و فلاسفہ اور دیگر مخالفین اسلام کا دندان شکن جواب دیا وہیں پر اصل اسلامی تعلیمات کا پیغام بھی پہنچایا۔ مگر غیر اہلِ سنت متکلمین نے بعض غیر مسلم عقل پرستوں کا جواب تو دیا لیکن دوسری طرف ان سے مرعوب ہو کر بہت سی کتاب و سنت سے ثابت شدہ اور حق تعلیمات کی غلط تاویل کر ڈالی یا انکار کر دیا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اہلِ سنت اور غیر اہلِ سنت کا راستہ بدل جاتا ہے اور یہی حال دورِ جدید کے مفکرین کا بھی ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لوگوں کا جواب دینے میں قدیم معتزلہ ہی جیسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ سرسید اور ابو الکلام آزاد سے علماے اہلِ سنت کا اختلاف اسی وجہ پر تھا کہ دونوں اور ان جیسے مفکرین اسلامی تعلیمات کی تشریح میں خود کتاب و سنت کی تفصیل سے روگرداں تھے اور غیر مقلدین و دیوبندی و قادیانی مکاتب فکر سے اختلاف کی وجہ بھی یہ ہی ہے کہ یہ مکاتبِ فکر قدامت پسند ہونے کے باوجود کتاب و سنت و جمہور امت کے مسلمات کے خلاف جا پڑے تھے۔

اس سہ رُخی مقابلہ میں موجودہ دور میں کچھ وہ لوگ جو تاریخ و مذاہب کا مطالعہ نہیں رکھتے چوتھی غلطی کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس لیے موجودہ دور کے علما پر بھی لازم ہے کہ ان فرقوں اور ان کی تعلیمات کی تفصیل اور تاریخ ان کو معلوم ہو۔ لہٰذا اب ہم اگلی قسط میں ان شاء اللہ اہلِ سنت کے عقائد کی مختصر تفصیل اور ساتھ میں غیر اسلامی فکر کا ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور بعد میں ماضی قریب و حال میں عقائد اسلامیہ کے خلاف یا موافق رجحانات کا جائزہ لیں گے۔ ساتھ ہی کتاب و سنت میں کچھ ایسے علمی حقائق کا ذکر کریں گے جو ان کے لیے معجزہ ہیں۔ (باقی آئندہ ماہ)

-----☆☆☆☆☆☆☆☆-----

تاریخی حقائق

یہودی قوم کی امن مخالف پالیسیاں

ماضی اور حال کے آئینے میں

محمد طفیل احمد مصباحی

مکر و فریب، جبر و تشدد، تعلیماتِ ربانی سے بے زاری، سرکشی و فتنہ انگیزی، جنسی بے راہ روی، شراب نوشی اور اخلاقی اقدار کی پامالی جیسی قبیحات کو باہم جوڑا جائے تو حاصل ضرب "قوم یہود" نکلے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس قوم کو منصبِ نبوت و رسالت کے ساتھ مال و دولت سے بھی وافر حصہ عطا کیا تھا۔ خبثِ باطنی اور فتنہ پرور ذہنیت نے علم بردارانِ یہودیت کو نہ دنیا میں باعزت مقام عطا کیا نہ آخرت کی سعادتوں سے بہرہ مند ہونے دیا بلکہ دربدر کی زندگی اور طاقت ور اقوام کی کاسہ لیسی ہی ان کی تقدیر ٹھہری۔

بحکمِ خداوندی اہلِ یہود کے سروں پر ذلت و مسکنت کی کالی گھٹائیں مسلط کر دی گئیں۔ جہاں کہیں رہے اپنے خبثِ باطنی کا بھرپور ثبوت فراہم کرتے رہے، جس کی پاداش میں متعدد ممالک نے اس فسادی قوم کو متعفن لاش سمجھ کر اپنی سرحدوں سے باہر پھینک دیا۔ کائناتِ عشق کی راج دھانی مدینہ طیبہ میں بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع نامی یہودی قبائل مدتوں سے آباد تھے۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فتنہ انگیزی کے سبب وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔

متعدد ممالک سے یہودیوں کا اخراج:-

۵۸۶ ق.م. میں بابل کے مشہور حکمراں "بخت نصر" نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور بنی اسرائیلیوں کو گرفتار کر کے اپنا ملک لے گیا۔ وہ عرصۂ دراز تک ذلت آمیز زندگی گزارتے رہے۔ بالآخر ۵۳۶ ق.م. میں ایران کے بادشاہ "خسرو" نے بابل فتح کیا تو انھیں آزادی کی فضا اور سکون کے ایام نصیب ہوئے۔

یہودیوں کے امن مخالف رویے نے انھیں کہیں چین سے رہنے نہ دیا۔ کبھی پرتگال سے نکالے گئے تو کبھی اسپین سے ان کا اخراج ہوا۔ ۱۲۹۰ء میں برطانیہ نے شہر بدر کیا۔ ۱۳۰۶ء میں پہلی بار اور ۱۳۹۴ء میں دوسری بار فرانس سے کھدیڑے گئے۔ ۱۳۷۰ء میں بلجیم سے خارجہ ہوا تو ۱۳۸۰ء میں چیکوسلواکیہ میں ان کا عرصۂ حیات تنگ کر کے یہاں سے بھگایا گیا۔ ۱۴۴۴ء میں حکومت ہالینڈ کی جانب سے یہودیوں کے متعلق "گیٹ آؤٹ" کا سرکاری فرمان جاری ہوا۔

اسی طرح ۱۵۴۰ء میں اٹلی کی سرزمین سے "بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" کے مصداق یہودیوں کو نکلنا پڑا۔ ۱۵۵۱ء میں جرمنی نے انھیں دھکے دے کر باہر کر دیا۔ ۱۵۱۰ء میں روس نے صیہونی فتنہ پردازیوں سے اپنے ملک کو پاک کیا اور اسی طرح فرمانِ الٰہی "ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ." کی صداقت آشکارا ہوئی اور دنیا والوں نے مشاہدہ کیا کہ ذلت و رسوائی کا جو دائمی عذاب خداے جبار و قہار نے یہودیوں پر مسلط کر دیا تھا وہ کس طرح ان کے حق میں قیامت خیز ثابت ہوا۔ الامان والحفیظ۔

یہودی شرارت کے چند نمونے:-

ظلم و جبر، فتنہ انگیزی اور دہشت گردی کے ذریعہ امنِ عالم کو پارہ پارہ کرنے کی سیاہ تاریخ رقم کرنے والے افراد کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہودی سرفہرست ہوں گے۔ سو اصلاتی نظام اور جدید ذرائع ابلاغ کے بل بوتے پوری دنیا کو یہودیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش اور الیکٹرانک میڈیا کے توسط سے جنسی بے راہ روی، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اقوامِ عالم کی ذہن سازی اور اخلاقی اقدار کی پامالی، یہودی خباثتوں کے قابلِ ذکر نمونے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں قلبِ فلسطین میں "ریاستِ اسرائیل کا قیام" ۱۹۶۷ء میں "بیت المقدس" پر قبضہ، فلسطینی عوام کا ناحق کشت و خون، آئے دن ان کی اراضی کو اسرائیلی ریاست کا حصہ بنانا اور اب مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ "ہیکلِ سلیمانی" (قدیم یہودی عبادت گاہ) تعمیر کرنے کی درپردہ منظم سازش۔ یہ وہ ٹھوس حقائق ہیں جن پر شکوک و شبہات یا کذب و انکار کے مصنوعی پردے نہیں ڈالے جا سکتے۔

دینِ عیسوی جو در اصل حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی

tufailmisbahi@gmail.com

پاکیزہ تعلیمات پر مشتمل تھا، اس کا سابقہ حلیہ بگاڑ کر من گڑھت عقائد و نظریات سے مملو ایک نیا دین قائم کرنا اور توحید کے بجائے حلول و تجسیم اور تثلیث و ابنیت کا ایمان سوز ملغوبہ تیار کر کے دینِ عیسوی میں شرک کا زہر گھولنے والا کوئی اور نہیں بلکہ وہ یہودی عالم پولس (سینٹ پال) تھا۔ لہٰذا موجودہ عیسائیت کا بانی حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام نہیں بلکہ سینٹ پال ہے۔

کمیونزم کے سقوط کے بعد "تہذیبی تصادم" کا نظریہ پیش کر کے اقوامِ عالم کو اسلام کے خلاف مورچہ سنبھالنے کی ترغیب دینے میں یہودی لابیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ چناں چہ ۱۹۹۰ء میں امریکی خارجہ پالیسی کے اہم رکن "ہنری کیسنجر" نے بین الاقوامی ایوانِ تجارت کی سالانہ کانفرنس میں شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب صورتِ حال یہ ہے کہ مغرب کے سامنے عالمِ عربی و اسلامی میں جو نیا دشمن ہے اور جس کا اس کو سامنا کرنا ہے وہ اسلام ہے۔"

انھیں کا دوسرا بیان ۲۰۰۱ء میں اس طرح سامنے آیا کہ "اسلامی تشدد اور دہشت گردی کے خلاف کل کے بجائے آج ہی جنگ کا آغاز کر دینا چاہیے۔" (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، ص:۳۱)

اسلام کی چادرِ رحمت پر دہشت گردی کا دھبہ لگانے والے یہودی شاید اس طرح کا اسلام مخالف بیان دے کر اپنے داغِ عصیاں کو دھلنا چاہتے ہیں، ورنہ دنیا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ ابتدائی ایام سے لے کر تاہنوز "یہودیوں" سے بڑھ کر دہشت گرد قوم آج تک صفحۂ دہر میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر اڑانے میں یہودی سازش دنیا کے سامنے عریاں ہو چکی ہے۔ اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس تجارتی محل میں پانچ ہزار سے زائد یہودی کام کرتے تھے مگر حملہ کے وقت ایک بھی یہودی موجود نہ تھا۔

مندرجہ بالا تمام تر واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج یہودی تحریک اپنی خباثت، ڈپلومیسی، اور شطرنجی چال کا سابقہ ریکارڈ توڑتے ہوئے کس طرح پوری دنیا میں دندناتی پھر رہی ہے اور اپنی ارہابی کارروائیوں سے عالمی سکون کو غارت کر رہی ہے۔ اقوامِ عالم کے رہ نماؤں کو دہشت گردی کے خاتمے کو یقینی بنانے کے لیے یہودیوں کی امن مخالف پالیسیوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبالِ جرم کے طور پر ذیل کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آج ہر طرف جو دہشت گردی اور بربریت پھیلی ہوئی ہے اس کا سرچشمہ ہم (یہودی) ہی ہیں۔"

(یہودی پروٹوکولز، ص:۱۳۵)

امن مخالف پالیسیاں:- اقوامِ عالم پر قیادت کے افسانوی خیال کو حقیقت کا عملی جامہ پہنانے کے لیے سوئزر لینڈ کے شہر "بال" میں تین سو یہودی دانش ور جمع ہوئے اور پوری دنیا پر بلا اشتراکِ غیرے حکمرانی کا منصوبہ تیار کیا گیا اور ہر طرح کی ملی، اقتصادی، علمی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی ترقیات کے حصول میں میڈیا کو "ہراول دستہ" کے طور پر استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جدید ذرائعِ ابلاغ اور عالمی میڈیا کے پچانوے فی صد حصے پر یہودیوں کا تسلط و غلبہ ہے جو یہودی افکار و خیالات کی لمحہ بہ لمحہ ترجمانی اور اسلام کے خلاف اقوامِ عالم کی ذہن سازی کرتا رہتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے غلط پروپیگنڈے اور نفرت و حقارت کا ماحول تیار کرنے میں دنیا بھر کے میڈیا کی حالت تقریباً یکساں ہے۔

پرستارانِ صیہونیت نے اپنے ۱۹/ پروٹوکولز میں تسخیرِ کائنات سے متعلق جو دفعات و ترجیحات متعین کیے ہیں ان کے چند اقتباسات جو انسانیت سوز اور اخلاقی قدروں سے کوسوں دور ہیں، ہدیۂ قارئین ہیں:

"فری میسنز" یہودیوں کی قابلِ ذکر تنظیم ہے، اس تنظیم کو دیگر مذاہب سے نمٹ کر یہودی ثقافت کو عام کرنے کے مندرجہ ذیل فرائض سونپے گئے ہیں:

"لوگوں کو مذہب سے بے گانہ اور بدظن کیا جائے۔ مقامی مذاہب کا تنقیدی مطالعہ کر کے ان میں سے منفی نکات یوں ترتیب دیے جائیں کہ انھیں پھیلا کر انتشار کی صورت پیدا کی جا سکے۔ مختلف مذاہب کی مقتدر شخصیات کو آپس میں لڑایا جائے، مذہبی کتابوں کے اوراق پھاڑ کر راتوں کو عام جگہوں پر پھیلا دیے جائیں۔ مختلف مذاہب اور فرقوں کے مابین چلی آ رہی پرانی رنجش اور سابقہ چپقلش کو تیز تر کر دیا جائے۔"

(یہودی پروٹوکولز، ص:۹۸، ملی پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی)

قارئین! اس عبارت سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ ازلی بدبخت قوم آج دنیا کو کس ہلاکت خیز دہانے تک لے جانا چاہتی ہے اور مختلف مذاہب کے لوگوں کو آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔

توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل اور سیاسی مفادات کے حصول میں ہر طرح کی جائز، ناجائز پالیسیاں اپنانے کو اہلِ یہود اپنے حق میں جائز سمجھتے ہیں: "کامیاب حکمرانی جبر و تشدد کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے، علمی بحث مباحثوں سے نہیں۔" (ایضاً، ص:۱۰۶)

"مضبوط حکمرانی کے خواہش مند شخص کو مکر و فریب، چالاکی، عیاری، ظاہر داری اور بناوٹی رویہ اختیار کرنے پر قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ دیانت و امانت، قومی کردار اور حق گوئی وغیرہ قسم کی اخلاقی اقدار کا راز سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ سیاست میں یہ چیزیں خوبیاں نہیں بلکہ عیب شمار ہوتی ہیں۔ اگر رشوت، دغا و فریب، نیز غداری و بے وفائی کے حربوں سے کامیابی مل سکے تو ان کے استعمال سے قطعاً گریز نہیں کرنا چاہیے۔"

(مصدرِ سابق، ص:۱۰۹-۱۱۱)

آج عالمی سطح پر مذہبی جنگ اور مختلف اقوام کے درمیان رقابت و دشمنی کی جو عالم سوز چنگاریاں بھڑک رہی ہیں اس سے اس بات کا شدید امکان ہے کہ کسی وقت بھی "تیسری عالمی جنگ" چھڑ جائے۔ ایسے میں یہودیوں کی امن مخالف پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سنگین صورتِ حال کے اصل ذمہ دار قومِ یہود ہے۔

ظلم و جبر کی تاریخ میں "اڈوف ہٹلر" کی طرح ظالم و جابر اور انسانیت دشمن افراد بہت کم ہی ملیں گے مگر فلسطینی عوام کے ساتھ اسرائیلی جارحیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی ظلم و بربریت میں "ہٹلر" سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ پرستارانِ یہودیت کو ان کی شرانگیزی کا مزہ چکھانے کے لیے ۵۰/ لاکھ سے زائد یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہٹلر نے اس قوم کی شرارت اور دوغلی پالیسی کا اظہار اس طور پر کیا تھا "ہر یہودی اصلاً بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے کام لیتا ہے، اس کا مقصد روپیہ پیدا کرنے اور دوسروں کو لوٹنے کے سوا کچھ نہیں، وہ (یہودی) مختلف جماعتوں میں شریک ہو کر اندر سے جنگ کرتے ہیں۔" (کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی، ص:۲۲۳)

ہٹلر کے بیان سے یک گونہ اتفاق کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر دور میں اہلِ یہود کی یہی جنگی کیفیت رہی ہے۔ موجودہ دور میں یہودی منصوبہ بند طریقے سے عیسائیت کے در و بست پر حاوی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں صیہونی اثر و رسوخ کا یہ عالم ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر امریکہ ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ امریکی میڈیا پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ مشہور امریکی صنعت کار "ہنری فورڈ" کے بقول ۱۸۸۵ء سے پہلے امریکی سماج میں بے حیائی کا وجود خال خال تھا لیکن یہودی قوم نے صحافت و میڈیا کے ذریعہ امریکی سماج کو تباہی و بربادی کی کگار پر کھڑا کر دیا۔" (ملخصاً از مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، ص:۱۲۶)

آر. ایس. ایس. جیسی فرقہ پرست تنظیم سے یہودی خفیہ ایجنسی "موساد" کی خفیہ سازش اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا اقوامِ عالم کے رہ نماؤں کو انسدادِ دہشت گردی مہم چلانے سے پہلے یہودیوں کی امن مخالف پالیسیوں پر نظر رکھنی ہوگی، تب کہیں جا کر ان کی مشترکہ کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں ورنہ عالمی نقشے پر ریاست اسرائیل کے ہوتے ہوئے دہشت گردی کا خاتمہ تقریباً ناممکن ہے۔

---★★★---

اعتذار

دسمبر ۲۰۰۹ء میں بزمِ دانش کے کالم میں پہلی تحریر مولانا ساجد رضا مصباحی کی تھی۔ قلم کار کا نام غلطی سے چھوٹ گیا تھا۔ **ادارہ** معذرت خواہ ہے۔

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں

بھیونڈی میں

۴۰۰ کوٹر گیٹ، کوٹر گیٹ مسجد کے سامنے

دفتر رضا اکیڈمی کے نیچے، بھیونڈی تھانے، مہاراشٹر

9822160520

ہزاری باغ، جھارکھنڈ میں

جناب قاری محمد ہاشم صاحب

بھورانی جگد مبا مارکیٹ، جی. جی. ایس. روڈ

ہزاری باغ، جھارکھنڈ

علامہ عبدالرحمٰن جامی

محمد ہارون مصباحی

نام و نسب:۔ عبدالرحمٰن بن نظام الدین احمد بن شمس الدین محمد دشتی۔ لقبِ اصلی عماد الدین، لقب مشہور نور الدین، کنیت ابو البرکات اور تخلص جاؔمی ہے۔ امام، شیخ الاسلام، صوفی، عارف باللہ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور اہلِ علم کے درمیان "ملاجامی" سے مشہور ہیں۔ سلسلۂ نسب امام محمد بن حسن شیبانی (م:۱۸۹ھ) تک پہنچتا ہے جو امامِ اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (م:۱۵۰ھ) کے ممتاز شاگرد تھے۔ (۱) امام محمد قدس سرہ کی اولاد میں سے قوام الدین محمد اپنے وطن سے ہجرت کر کے "جام" میں آگئے تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی مولانا مفتی حاجی شاہ کے عقد میں دے دی۔ حاجی شاہ کی بیٹی شیخ شمس الدین محمد دشتی کے نکاح میں آئیں، جن سے علامہ جامی کے والد نظام الدین احمد پیدا ہوئے۔ والدِ ماجد اور جدِ امجد اربابِ علم و تقویٰ میں سے تھے، ان کا اصلی وطن اصفہان تھا، دشت نامی محلہ میں رہتے تھے۔ حوادثِ زمانہ کے سبب وہاں سے خراسان کے ایک قصبہ جام میں آگئے اور قضا و فتویٰ کا کام سنبھالا۔ (۲)

ولادت و وطن:۔ آپ ۲۳/ شعبان ۸۱۷ھ / ۷/ نومبر ۱۴۱۴ء میں عشا کے وقت خراسان کے ایک قصبہ جام میں پیدا ہوئے۔ (۳) خراسان جنوبی ایشیا کا ایک قدیم خطہ ہے جس کے مشہور شہر نیشاپور، ہرات، بلخ، اور مرو تھے۔ اب اس کو ایران، افغانستان اور ترکمانستان تین ملکوں نے بانٹ لیا ہے۔ اس وقت خراسان مشرقی ایران کا ایک صوبہ ہے جو ترکمانستان اور افغانستان کی سرحدوں کے قریب ہے۔ نیشاپور اسی میں ہے، جب کہ بلخ اور ہرات افغانستان مین شامل ہو چکے ہیں۔ (۴)

تعلیم، اساتذہ اور فضل و کمال:۔ آپ نے چھوٹی عمر میں ہی والدِ محترم سے علمِ نحو و صرف کی تعلیم حاصل کی۔ پھر والد کے ساتھ ہرات آگئے اور مدرسہ نظامیہ میں مقیم ہوئے۔ وہاں علامہ جنید اصولی (یاجند اصولی) کے درس میں حاضر ہوئے۔

اس وقت کچھ طلبہ شرح مفتاح اور مطول پڑھ رہے تھے۔ جامی اگرچہ بہت خرد سال تھے، لیکن ان کے اندر کتاب فہمی کی بھرپور استعداد تھی، لہٰذا وہ بھی مطول اور حاشیۂ مطول پڑھنے لگے۔ پھر سید شریف جرجانی قدس سرہ (م:۸۱۶ھ) کے نامور شاگرد خواجہ علی سمرقندی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور چالیس دن تک اکتسابِ علم کیا۔ پھر شیخ شہاب الدین محمد جاجرمی تلمیذ علامہ سعد الدین تفتازانی قدس سرہ (م:۷۹۲ھ) کے درس میں حاضر ہوئے اور استفادہ کیا۔ اس کے بعد سمرقند جا کر قاضی زادۂ روم صلاح الدین موسیٰ بن احمد شارحِ ملخص الھیئۃ کے مدرسہ میں حاضر ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے بحث ہو گئی اور آپ غالب رہے۔ مولانا فتح اللہ تبریزی جو سلطان الغ بیگ کی کچہری کے صدر الصدور تھے، بیان کرتے ہیں کہ قاضیِ روم علامہ جامی کی اکثر تعریف کیا کرتے اور کہتے کہ جب سے سمرقند آباد ہوا ہے جدتِ طبع اور قوتِ تصرف میں جامی کے پائے کا کوئی شخص دریائے آمویہ عبور کر کے اس پار نہیں آیا۔ مولانا ابو یوسف سمرقندی تلمیذِ قاضیِ روم کہتے ہیں کہ جب علامہ جامی سمرقند آئے تو قاضیِ روم سے شرح تذکرہ پڑھنے لگے۔ قاضیِ روم نے اس کتاب کے حواشی پر کچھ تعلیقات لکھ رکھی تھیں، جامی ان تعلیقات پر اعتراض کرتے اور خوب بحث ہوتی، آخر میں قاضیِ روم کو جامی کے قول کے مطابق ان میں اصلاح کرنا پڑی۔ قاضیِ روم جامی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی شرح ملخص الھیئۃ بھی آپ کو دکھائی۔ آپ نے اس میں وہ تصرفات کیے جو قاضیِ روم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

آپ ہرات میں تھے کہ ایک دن ملا علاء الدین علی قوشجی شارحِ تجرید سے مباحثہ ہو گیا۔ ملا علی قوشجی نے فنِ ہیئت کے چند بے حد مشکل سوالات سامنے رکھے۔ آپ نے ان کا ایسا مسکت جواب دیا کہ ملا قوشجی حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے بعد ملا قوشجی اپنے شاگردوں سے کہا کرتے کہ اس دن میں نے جان لیا کہ "واقعی اس دنیا میں

استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

نفسِ قدسی موجود ہے۔" (۵)

[نفسِ قدسی فلسفے کی اصطلاح میں وہ قوت ہے جس کے ذریعہ تفکر کی مدد کے بغیر بہت ہی معمولی سے وقت میں مشکل مسائل کو سمجھ لیا جائے۔]

درج ذیل واقعہ علامہ جامی کے علمی جلال، رفعتِ مقام اور آفاقی شہرت کی کھل کر شہادت دیتا ہے:

"مولائے اعظم محی الدین الفناری اپنے والد مولا علی الفناری [یہ سلطان محمد خاں فاتح کی چھاؤنی کے قاضی تھے] سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے والد کہتے ہیں: "ایک دن سلطان نے کہا: جویانِ علومِ حقیقت، متکلمین، صوفیہ اور حکما ہیں۔ [اور ان میں باہم کچھ اختلاف ہے]۔ ان کے بیچ محاکمہ ہونا چاہیے۔ اس پر میں نے کہا: مولانا عبد الرحمن جامی کے سوا کوئی بھی ان کے درمیان محاکمہ نہیں کر سکتا۔ چناں چہ سلطان نے ایک قاصد جامی کے پاس بھیجا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ یہ محاکمہ انجام دیں۔ علامہ جامی نے جواباً ایک رسالہ لکھا جس میں ان تینوں جماعتوں کا چھ مسئلوں پر محاکمہ کیا۔ ان میں سے پہلا مسئلہ وجود کا تھا۔ علامہ جامی نے یہ رسالہ سلطان کے پاس بھیج دیا اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر یہ رسالہ پسند ہو تو باقی مسائل پر بھی قلم اٹھایا جائے ورنہ وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

روحانی پیشوا:۔ آپ انتہائی انہماک، توجہ اور لگن کے ساتھ علم کی جستجو میں لگے رہے، یہاں تک کہ اپنے دور کے جید علما و فضلا میں شمار ہونے لگے۔ پھر بھی آپ کو قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ ایک رات خواب میں کسی بزرگ کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے: "اتخذ حبیبا یھدیک۔" [کوئی دوست دیکھو جو تمھیں باطنی علوم کی راہ دکھائے۔] جامی اس خواب سے بے حد متاثر ہوئے، طبیعت میں ہلچل مچ گئی، چناں چہ سمرقند سے خراسان جا کر مخدومِ ملت خواجہ سعد الدین کاشغری قدس سرہ [م:۸۶۰ھ] سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہو گئے۔ پھر خواجہ ناصر الدین عبید اللہ الاحرار نقشبندی [م:۸۹۵ھ] کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنی کتابوں میں جگہ جگہ ان کے اوصاف و کمالات اور ان سے محبت و عقیدت کا ذکر کیا اور "استاذ" و "مخدوم" کے لقب سے انھیں یاد کیا ہے۔

علامہ جامی نے خواجہ محمد پارسا، مولانا فخر الدین لورستانی، خواجہ برہان الدین ابو نصر پارسا، شیخ بہاء الدین عمر، خواجہ شمس الدین محمد کوسوئی اور مولانا جلال الدین پورانی وغیرہ بہت سے مشائخ سے بھی ملاقات کی۔ (۷)

شعر و شاعری:۔ علامہ جامی کا ایک روحانی کمال ان کا ملکۂ شاعری ہے۔ شاعری ان کی فطرت بن چکی تھی، اور یہی پر جوش و پر سوز فطرت ان کو شعر گوئی کی راہ دکھاتی، اور یہ درحقیقت اس والہانہ عقیدت اور بے پناہ عشق و محبت کا اثر تھا جو انھیں محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھی۔ جب وہ محبوبِ خدا کا بے مثال جمال تصور و خیال میں بساتے تو ان کا ذوقِ شاعری شعلۂ جوالہ بن جاتا، اور جمالِ محبوب کے مظاہر ان کی حساس طبیعت کو تحریک دیتے، جس کے نتیجے میں ان کے قلم سے آگ کے شعلوں سے زیادہ پر سوز اشعار نکلتے۔ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار محبوبِ خدا سے ان کی سچی محبت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

یا شفیع المذنبین بارِ گناہ آوردہ ام
بر درت ایں بار با پشتِ دوتاہ آوردہ ام
عجز و بے خویشی و درویشی و دل ریشی و درد
ایں ہمہ بر دعویٔ عشقت گواہ آوردہ ام
دولتم ایں بس کہ بعد از محنت و رنجِ دراز
بر حریمِ آستانت می نہم روئے نیاز (۸)

(ترجمہ) اے عاصیوں کے شفیع! میں بارِ گناہ کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ گناہوں کا یہ بار دوہری پشت پر آپ کے در پر لایا ہوں۔ بے بسی، بے خودی، درویشی، دل سوزی اور درد و بے چینی ان سبھی کو آپ سے عشق کے دعوے پر بطور گواہ لایا ہوں۔ میرا سرمایہ بس یہی ہے کہ بڑی مشقت و بے چینی کے بعد آپ کے آستانہ حرم پر سرِ نیاز جھکا رہا ہوں۔

جامی کے اسفار:۔ علامہ جامی نے اپنی زندگی میں بہت سے علاقوں کا سفر کیا۔ چند مشہور اسفار یہ ہیں:

(۱) بچپن میں والدِ محترم کے ہم راہ جام سے ہرات آنا اور مدرسہ نظامیہ میں قیام کرنا۔
(۲) جوانی میں شاہ رخ کے عہد [۸۱۷ھ–۸۵۰ھ] میں ہرات سے سمرقند جانا۔
(۳) سمرقند سے ہرات واپس آنا، علاء الدین علی قوشجی سے ملاقات اور حضرت سعد الدین کاشغری سے بیعت ہونا۔

(۴) خواجہ عبید اللہ الاحرار کی زیارت کے لیے ہرات سے مرو جانا۔[9]

(۵) آپ کے علم و فضل کی شہرت سلطان بایزید خاں تک پہنچی تو اس نے بہت سے قیمتی تحائف آپ کی بارگاہ میں بھیجے اور اپنی مملکت میں تشریف لانے کی درخواست کی اور ان کے لیے سامانِ سفر کا انتظام بھی کر دیا۔ آپ تیار ہو گئے اور خراسان سے ہمدان پہنچ گئے۔ اس وقت روم میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی اس لیے آپ نے ہمدان سے آگے جانے سے انکار کر دیا اور تحائف لانے والے سے کہہ دیا میں اب روم جانے سے معذور ہوں، امید ہے کہ سلطان درگزر کریں گے۔[10]

(۶) **سفر حج:**- ۸۷۷ھ میں حج کے ارادے سے حجاز کے لیے رختِ سفر باندھا۔ راستہ میں ہمدان، کردستان، بغداد ہوتے ہوئے شہر محبوب مدینہ منورہ پہنچے، روضۂ نبوی کی زیارت کی اور پھر مکہ معظمہ پہنچے۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد دوبارہ مدینہ چلے گئے۔ روضۂ مقدسہ کی مکرر زیارت کے بعد شام روانہ ہو گئے اور دمشق، حلب اور تبریز ہوتے ہوئے خراسان واپس آئے۔ اس سفر میں آپ جہاں سے بھی گزرے وہاں کے علما و فضلا نے آپ کا شان دار استقبال کیا اور بڑی تعظیم و تکریم کی۔[11]

بارگاہ رسالت میں مقبولیت:- علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہ نے "دیباچۂ البشیر الکامل" میں جامی کی بارگاہِ نبوی میں مقبولیت کے تعلق سے یہ واقعہ درج کیا ہے:

"جناب خان بہادر بھیا شیخ بشیر الدین مرحوم نے اپنے استاذ معظم مولانا عبد السمیع بے دل سہارن پوری قدس سرہ مصنفِ انوارِ ساطعہ [م: ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء] سے روایت کی کہ ایک مرتبہ علامہ جامی ایک قصیدۂ نعتیہ لکھ کر مدینہ منورہ اس خیال سے روانہ ہوئے کہ روضۂ اقدس کے روبرو عرض کریں گے۔ محبوب کے حسین تصور میں سرشار جھومتے ہوئے چلے جا رہے تھے، جب شہر محبوب کے قریب پہنچے تو محبوبِ خدا ﷺ نے ایک شخص کو خواب میں یہ حکم فرمایا:

"جامی آ رہا ہے، اس سے کہہ دینا کہ قصیدہ کا یہ شعر یہاں نہ پڑھے۔

خواہم از شوق دست بوس تو برد
دست بیروں کن از یمانی برد

[میں محبت میں آپ کے ہاتھ چومنا چاہتا ہوں، اس لیے یمنی چادر سے ہاتھ باہر کیجیے]۔

ورنہ اس کی خاطر ہاتھ قبر سے باہر نکالنا پڑے گا، اور اس سے فتنۂ عظیم برپا ہونے کا خطرہ ہے۔"[12]

بارگاہِ اقدس میں علامہ جامی کی مقبولیت کے تعلق سے یہ واقعہ بھی قابلِ مطالعہ ہے:

"علامہ جامی جب مدینہ طیبہ سے واپسی کا ارادہ کرتے تو حضورِ اقدس ﷺ کے مواجہۂ اقدس میں حاضر ہو کر یوں اجازت چاہتے۔

بہ سفری روم چہ فرمائی۔ [جا رہا ہوں، کیا فرماتے ہیں؟]

حجرۂ مبارک سے آواز آتی:

بہ سلامت روی و باز آئی [سلامتی کے ساتھ جاؤ اور پھر آؤ]

جامی اس جاں نواز ارشاد پر جھوم اٹھتے اور پورے اطمینان کے ساتھ وطن واپس ہوتے کہ دوبارہ پھر حاضری ہو گی۔ اخیر بار جب واپسی کی اجازت چاہی تو یہ جواب ملا:

بہ سفر رفتنت مبارک باد [تم کو سفر میں جانا مبارک ہو]

یہ سنتے ہی جامی پر بجلیاں گر گئیں، زار و قطار رونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا: سرکار آپ کو مبارک باد دے رہے ہیں اور آپ ہیں کہ رو رہے ہیں، ماجرا کیا ہے؟ حضرت جامی نے فرمایا: اس سے پہلے روانگی کی اجازت چاہنے پر آواز آتی تھی: "بہ سلامت روی و باز آئی"۔ یہ دوبارہ حاضری کا پیغام ہوتا تھا، لیکن اس بار یہ ارشاد ہوا ہے:

"بہ سفر رفتنت مبارک باد۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ حاضری نصیب نہ ہو گی۔[13]

کرامات:- علامہ جامی صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے، آپ سے بہت سی کرامتوں کا ظہور بھی ہوا۔ انھیں میں سے ایک کرامت یہ ہے:

مولانا محمد روحی نقشبندی سے منقول ہے کہ وہ موسمِ بہار میں علامہ جامی کے ساتھ نہر مالان کے ساحل پر بیٹھے تھے کہ اچانک ایک مری ہوئی سیپی سطحِ آب پر ظاہر ہوئی۔ جامی نے اس کو اٹھا لیا اور اپنا ہاتھ اس کی پشت پر پھیرا، ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ اس میں زندگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ جب ہم نے وہاں سے اٹھ کر شہر کا رخ کیا تو وہ تیز قدموں کے ساتھ ہمارے پیچھے آنے لگی۔[14]

کتبِ تذکرہ میں اس کے علاوہ جامی کی اور بھی کرامات دیکھی

جا سکتی ہیں۔

وفات:- آپ ۸۱/ برس کے ہو چکے تھے، عمر کے ان آخری ایام میں بیمار ہو گئے، اور یہی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی۔ چناں چہ ۱۸/ محرم ۸۹۸ھ میں جمعہ کے دن ہرات میں آپ کی وفات ہو گئی۔ ہرات ہی میں اپنے پیر و مرشد حضرت سعد الدین کاشغری قدس سرہ کے مزار کے سامنے مدفون ہوئے۔ آپ کی تاریخ وفات آیتِ کریمہ "ومن دخلہ کان اٰمنا." سے نکلتی ہے، جسے کسی شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے۔

جامؔی کہ بود بلبلِ جنت بشوق رفت
فی روضة مخلدة أرضها السما
کلکِ قضا نوشت بدروازۂ بہشت
تاریخہ "ومن دخلہ کان اٰمنا"
—(۸۹۸ھ)—

علامہ عبد العلی آسی مدراسی لکھنوی [م: ۱۳۲۷ھ] نے اس کو خالص عربی میں یوں نظم کیا ہے۔

جامیُ ن الذی هو راح بجامنا
کالروح کان فی جسد القبر کامنا
قدمات بالهراة وقد حل بالحرم
اٰرّختہ "ومن دخلہ کان اٰمنا"[15]
—(۸۹۸ھ)—

علامہ جامی کی وفات کے ۱۹/ سال بعد ۹۱۱ھ میں خراسان پر دولتِ صفویہ قائم ہو گئی۔ اس کا اصل گہوارہ اردبیل تھا جو شمالی ایران کا ایک شہر ہے۔ سلاطین صفوی رافضی تھے، جب کہ جامی اجلہ علمائے اہلِ سنت میں سے تھے، اس لیے علامہ جامی کے تعلق سے ان کا رویہ بہت ہی ظالمانہ ثابت ہوا۔ "شذرات الذہب" میں علامہ ابن عماد حنبلی [م: ۱۰۸۹ھ] نے جامی کے مزار کے ساتھ کی گئی ان کی ایک سفاکانہ کارروائی کا ذکر یوں کیا ہے:

"جب اردبیل کے طاغوتی گروہ نے خراسان کا رخ کیا تو علامہ جامی کے فرزند ضیاء الدین یوسف نے آپ کی قبر کھود کر آپ کا جسدِ اطہر نکالا اور کسی دوسرے علاقے میں دفن کر دیا۔ جب اس طاغوتی گروہ کا خراسان پر تسلط ہو گیا تو انھوں نے جامی کی قبر کھود ڈالی، لیکن وہاں چند خشک لکڑیوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ انھوں نے قبر کی وہ لکڑیاں جلا ڈالیں۔[16]

اولاد:- جامی کے یہاں چار فرزند پیدا ہوئے:

۱. پہلا لڑکا صرف ایک دن زندہ رہا، ابھی اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔
۲. خواجہ صفی الدین محمد۔ یہ ایک سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔
۳. خواجہ ضیاء الدین یوسف۔ ۹/ شوال ۸۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اچھی خاصی عمر پائی۔ علامہ جامی نے "کافیہ" کی ایک عظیم الشان شرح لکھی اور اس کا نام "الفوائد الضیائیہ" انھیں کے نام پر رکھا۔
۴. خواجہ ظہیر الدین عیسیٰ۔ ۵/ محرم ۸۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ چالیس دن کی عمر پا کر یہ بھی فوت ہو گئے۔[17]

تصانیف:- آپ کی تصانیف کے تعلق سے علامہ عبد العلی آسی مدراسی کہتے ہیں:

"آپ نے عربی اور فارسی زبان میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کی تعداد چوّن تک پہنچتی ہے، جو آپ کے تخلص جامؔی کے اعداد کے برابر ہیں۔" تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) تفسیر القرآن۔ آیتِ کریمہ وایای فارهبون تک (عربی-نثر) (۲) ترجمۂ اربعین حدیث (فارسی- نظم)۔ (۳) شرح حدیث ابی رزین لقیط عقیلی صحابی۔ (فارسی-نثر)۔ (۴) شواھد النبوۃ (فارسی-نثر)۔ (۵) نفحات الانس من حضرات القدس (فارسی-نثر)۔ (۶) شرح فصوص الحکم (عربی-نثر) (۷) نقد النصوص فی شرح نقش الفصوص (فارسی- نثر)۔ (۸) الطریقۃ النقشبندیۃ۔ (۹) أشعۃ اللمعات (فارسی-نثر)۔ (۱۰) اللوامع (فارسی)۔ (۱۱) شرح القصیدۃ التائیہ (فارسی-نثر)۔ (۱۲) شرح رباعیات اللوائح (فارسی۔ نثر و نظم)۔ (۱۳) شرح البیتین الاولین من المثنوی المعنوی (فارسی-نثر و نظم)۔ (۱۴) شرح بیت امیر خسرو دھلوی (فارسی۔ نثر)۔ (۱۵) مجموعۂ کلمات خواجہ محمد پارسا (مخلوط)۔ (۱۶) رسالہ در تحقیق مذھبِ صوفیہ و متکلمین و حکما (عربی-نثر)۔ (۱۷) رسالہ فی وحدۃ الوجود (فارسی)۔ (۱۸) رسالہ فی أسئلۃ الھند وأجوبتھا۔ (۱۹) مناقب مولوی رومی (۲۰) رسالہ لا إلہ الا اللہ (فارسی-نثر) (۲۱) رسالۃ مناسک حج (فارسی-نثر)۔ (۲۲) رسالہ اعتقاد نامہ (فارسی- مثنوی) (۲۳) الفوائد الضیائیہ فی شرح الکافیہ (عربی-نثر)۔ (۲۴) صرف منظوم (فارسی)۔ (۲۵) صرف

منثور (فارسی)۔ (۲۶) شرح اشعار مائة عامل منظوم (فارسی-منظوم)۔ (۲۷) شرح مفتاح الغیب۔ (۲۸) مثنوی طرح نوی۔ (۲۹) سلسلة الذهب فی ذم الروافض۔ (۳۰) سلامان و آبسال (فارسی-مثنوی)۔ (۳۱) تحفة الاحرار (فارسی-مثنوی)۔ (۳۲) سبحة الابرار (فارسی-مثنوی)۔ (۳۳) یوسف زلیخا (فارسی-مثنوی)۔ (۳۴) لیلی مجنون (فارسی - مثنوی)۔ (۳۵) خرد نامۂ اسکندری (فارسی-مثنوی)۔ (۳۶) دیوانِ اول (فارسی)۔ (۳۷) دیوانِ ثانی (فارسی)۔ (۳۸) دیوانِ ثالث (فارسی)۔ (۳۹) دیوانِ رابع (فارسی)۔ (۴۰) رسالۂ کبیر در معما (فارسی-نثر)۔ (۴۱) رسالہ متوسط در معما (فارسی-نثر و نظم)۔ (۴۲) رسالہ صغیر در معما (فارسی-نثر)۔ (۴۳) رسالہ اصغر در معما۔ (۴۴) رسالہ فی العروض (فارسی-نثر)۔ (۴۵) رسالہ فی القوافی (فارسی-نثر)۔ (۴۶) رسالہ فی الموسیقی (فارسی-نثر)۔ (۴۷) بہارستان فی اللطائف والحکم (فارسی-نثر و نظم)۔ (۴۸) کبریٰ در ادبیات و منشات (فارسی)۔ (۴۹) صغریٰ در ادبیات و منشات (فارسی)۔ (۵۰) رسالة فی الهیأة۔ (۵۱) رسالہ فی الاصطرلاب۔ (۵۲) رسالة فی المنطق۔ (۵۳) حاشیۂ مفتاح۔ (۵۴) هدیة الخلان فی لطائف البیان۔[18]

لیکن تصانیفِ جامی کے سلسلے میں علامہ آسی کی یہ رپورٹ حتمی نہیں کہی جاسکتی، کیوں کہ کتبِ تاریخ و سیر پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جامی کی اور بھی تصانیف ہیں۔ مثال کے طور پر "کشف الظنون، هدیة العارفین، معجم المؤلفین، ارغام اولیاء الشیطان" وغیرہ کتبِ تاریخ میں "شرح النقایہ، ارشادیہ، لوائح، مناقب شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری" اور ان کے علاوہ دوسری تصانیف کا ذکر بھی ملتا ہے۔

علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہ نے "البشیر الکامل" میں محمد ماہ بن محمد انور کی کتاب "الدر المکنون" کے حوالے سے لکھا ہے کہ شرح مأ عامل (عربی) بھی علامہ جامی کی تصنیف ہے۔[19]

مولانا الٰہی بخش فیض آبادی قدس سرہ کی کتاب "التوضیح الکامل شرحِ شرح مأة عامل" کے آخر میں علامہ عبد العلی مدراسی کی فارسی زبان میں ایک تقریظ موجود ہے۔ اس پر علامہ مدراسی آسی نے التوضیح الکامل کے تعلق سے یہ لکھا ہے:

"اگر ملا جامی اس زمانے میں باحیات ہوتے تو یقیناً اس شرح کے افادات کے مے خانے سے جامِ استفادہ نوش کرتے۔"[20]

خود علامہ آسی کی اس تحریر سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تصانیف جامی کی تعداد چون ہی نہیں بلکہ زیادہ ہے۔

----﴿مصادر و مراجع﴾----

(۱) معجم المؤلفین، عمر رضا کحالہ، ۵ / ۱۲۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، سن ندارد- الأعلام، خیر الدین زرکلی، ۳ / ۲۹۶، دار العلم للملایین، بیروت، لبنان، طبع پانزدھم، مئی ۲۰۰۲ء- الفوائد البهیة، علامہ عبد الحی لکھنوی، ص: ۷۴، مکتبہ ندوة المعارف، بنارس، ہندوستان۔ طبع ۱۹۶۷ء-

(۲) علی اصغر حکمت نے اپنی کتاب "جامی" میں "رشحات عین الحیات" کے حوالے سے یہ تفصیلات درج کی ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ از عارف نوشاہی، ص: ۱۳۱، مطبوعہ رضا پبلی کیشنز، طبع ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء ہمارے سامنے ہے۔

(۳) الأعلام، ۳ / ۲۹۶ - الفوائد البهیة، ص: ۷۴ -

(۴) المنجد فی اللغة والأعلام، ص: ۲۳۱، مرکز اہل سنت برکات رضا، پور بندر، گجرات، ہندوستان طبع اول، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء-

(۵) الفوائد البهیة، ص: ۷۴-۷۵ - حدائق الحنفیة مترجم، ص: ۳۶۹-۳۷۰، تقسیم کار، ادبی دنیا، ٹیا محل، دہلی، ہندوستان، اشاعت ۲۰۰۶ء-

(۶) ارغام اولیاء الشیطان بذکر مناقب أولیاء الرحمن، محمد عبد الرؤف المناوی، ۴ / ۴۰۵، دار صادر بیروت، لبنان، طبع اول ۱۹۹۹ء-

(۷) الفوائد البهیة، ص: ۷۵ - ارغام اولیاء الشیطاین ۴ / ۴۰۴ -

(۸) کلیات جامی، ص: ۲۱-۲۲ - کتاب کے ابتدائی اوراق غائب ہونے کے سبب مطبع معلوم نہ ہو سکا۔

(۹) جامی (مترجم) ص: ۱۶۳، بحوالہ "رشحات عین الحیات"۔

(۱۰) إرغام أولیاء الشیاطین، ۴ / ۴۰۴ -

(۱۱) جامی (مترجم) ص: ۱۶۳، بحوالہ "رشحات عین الحیات"۔

(۱۲) البشیر الکامل، سید غلام جیلانی میرٹھی، ص: ۳۲، باہتمام کتب خانہ سمنانی۔ مقام اشاعت ندارد۔

(۱۳) مقالاتِ شارحِ بخاری، ۳ / ۱۲۱-۱۲۲، دائرة البرکات، گھوسی، مئو، ہندوستان۔ سن اشاعت ندارد۔ (۱۴) إرغام أولیاء الشیطان، ۴ / ۴۰۶ - ۴۰۷

(۱۵) ثمرات الحیات فی طبقات النحاة، علامہ عبد العلی آسی، طبعت مع شرح الجامی، ص: ۱۶، مجلس برکات، الجامعة الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، ہندوستان۔ سن اشاعت ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء۔

(۱۶) شذرات الذهب فی أخبار من ذهب، ابن العماد حنبلی، ۷ / ۳۶۱، دار الفکر بیروت۔ سن، اشاعت ندارد۔

(۱۷) جامی (مترجم)، ص: ۱۶۰ تا ۱۶۲، بحوالہ "رشحات عین الحیات"۔

(۱۸) ثمرات الحیاة، ص: ۱۶ - (۱۹) البشیر الکامل، ص: ۳۱-

(۲۰) التوضیح الکامل، علامہ الٰہی بخش فیض آبادی، ص: ۱۲۸، مطبع نظامی واقع کان پور، ہندوستان ☆☆☆

آئینۂ عالم

جامعة الازہر مصر حجاب کا مخالف نہیں

تاج محمد خاں ازہری

خود عورتوں ہی کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لیے اسلام نے انھیں پردے کا حکم دیا ہے اور نصیحت کی ہے کہ بلاضرورت تنہا گھر سے باہر نہ نکلیں اور اگر ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا ہو تو کسی محرم کے ساتھ نکلیں اور فتنے کا اندیشہ ہو تو نقاب کے ساتھ گھر سے باہر جائیں۔ مگر مخالفین اسلام نے، اسلام کی اس حکیمانہ نصیحت اور تعلیمات کو آزادیِ نسواں کی مخالفت کا رنگ دے کر صنف لطیف (عورتوں) کو خوب ورغلایا، یہاں تک کہ بعض ناعاقبت اندیش خواتین ان نام نہاد اور جھوٹے آزادیِ نسواں و حقوق مراۃ کا دم بھرنے والوں کے دام فریب میں آگئیں، اور گلی کوچوں، سڑکوں اور بازاروں میں بے حجاب گھومنے لگیں، جس کے نتیجے میں شہوت پرستوں نے ان عورتوں کے ساتھ کبھی صرف چھیڑ چھاڑ پر ہی اکتفا کیا اور گاہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ جسے احاطۂ تحریر میں لانے سے قلم بھی حیا کرتا ہے۔ اخبار و رسائل پڑھنے و سننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں یومیہ درجنوں خبریں صرف خواتین کے اغوا اور زنا بالجبر کے متعلق ہوتی ہیں، اور یہ صرف اسلامی تعلیمات سے انحراف اور عریانیت کی دین ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ یہ واقعات حالیہ ایام میں اتنی کثرت سے وقوع پزیر ہو رہے ہیں کہ گزشتہ کل (۱۴ نومبر ۲۰۰۹ء) کو انگریزی اخبار دی ہندو (THE HINDU) میں ایک نیوز پڑھی جس میں خواتین نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا (Make Delhi safe for women یعنی خواتین کے لیے دہلی مامون و محفوظ بنائی جائے)۔ مگر دہلی عورتوں کے لیے مامون و محفوظ شہر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ خود تبرج و عریانت سے دوری نہ اختیار کریں گی۔ اور یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر خواتینِ اسلام نے جو انھیں پردے کا حکم دیا ہے اس پر کما حقہ عمل پیرا ہو جائیں تو حوادث اغوا و زنا بالجبر اگر یکسر نہیں ختم ہوں گے تو کم از کم شبہ معدوم ضرور ہو جائیں گے۔

تقریباً سال دو سال قبل فرانس جو کہ اپنے آپ کو انسانی حقوق و آزادیِ نسواں اور آزادیِ فکر کا علمبردار گمان کرتا ہے اس نے یہ قانون بنایا کہ فرانس کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کوئی بھی طالب علم کسی بھی مذہبی شعار (لباس) کا استعمال نہیں کر سکتا یعنی کوئی بھی لڑکا نہ تو عمامہ یا ٹوپی پہن سکتا ہے اور نہ ہی کوئی لڑکی نقاب پہن سکتی ہے۔ یہی قانون اگر کسی مسلم ملک نے نافذ کیا ہوتا تو پورا یورپ، امریکہ اور دنیا کے تمام سمعی اور بصری ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف قدامت پرستی اور رجعت پسندی کا اتنا پروپگنڈہ کرتے کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ مگر حکومت فرانس کے اس موقف کے خلاف سب کے منھ میں دہی جما رہا حتی کہ یورپ کے آزادیِ فکر اور آزادیِ صحافت کے وہ علم بردار بھی چپی سادھے رہے جنھوں نے ڈنمارک کے ان صحافیوں کا صرف دفاع ہی نہیں بلکہ صحافتی آزادی کے نام پر حمایت بھی کی تھی جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کارٹون بنا کر شائع کیا تھا۔

اس کے برعکس ابھی گزشتہ چند ماہ قبل ہی یہ خبر کافی دنوں تک میڈیا کی سرخیوں میں رہی کہ عالم اسلام کی عظیم و قدیم یونیورسٹی الازہر الشریف کے شیخ الجامعہ محمد سید طنطاوی نے حجاب پر پابندی عائد کردی ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ کوئی بھی طالبہ الازہر یونیورسٹی میں نقاب نہیں پہن سکتی۔ تقریباً آٹھ سال کا عرصہ میں نے بھی وہاں گزارا ہے لہٰذا جب میں نے یہ خبر انٹرنٹ پر بی.بی.سی. عربک (B.B.C.Arabic) کی ویب سائٹ پر، بعدہ ہندوستانی اخبار و رسائل میں پڑھی تو میں انتہائی حیرت میں پڑ گیا کہ بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مصر پر بھلے ہی مغربی تہذیب کا غلبہ ہے، اس لیے کہ جمہوریت کے نفاذ سے قبل یکے بعد دیگرے مصر پر فرانس اور انگلینڈ کا استعمار تھا۔ استعمار کا خاتمہ تو ہوا تن کے گورے من کے کالے انگریز مصر چھوڑ کر چلے بھی گئے مگر اپنی تہذیب و ثقافت چھوڑ گئے۔ لیکن پھر بھی مصر میں جو آج دین داری باقی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ الازہر الشریف ہی کی دین ہے۔ اسی سبب مصر کو "بلد الازہر الشریف" کہا اور لکھا جاتا ہے، اور خود الازہر الشریف کو "کعبة العلم" اور "منارة العلم" سمجھا جاتا ہے۔ جس ادارے کو مسلمان اتنی اہمیت

البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنش، جمال پور علی گڑھ (یوپی)
Email:mtaj75@gmail.com

دیتے ہوں وہی اگر فرمان خداوندی کی خلاف ورزی کرے اور عدوے اسلام (فرانس) کے نقش قدم پر چلے تو حیرت اور تکلیف بہر حال ہوگی۔ مگر میڈیا کی اس خبر پر مجھے یقین کامل ہرگز نہ تھا، ایسے میڈیا کا اعتبار بھی کیسے ہو جو مسلمانوں کے ہر معاملے میں ہمیشہ عصبیت اور سوتیلا پن سے کام لیتا ہو، اور کسی حادثے میں اگر چالیس افراد جاں بحق ہوتے ہیں تو خبر صرف چار کی دیتا ہو۔ میڈیا کے صرف یہی نقائص وعیوب نہیں ہیں بلکہ اس کی عادت یہ بھی ہے کہ خبر پر کشش اور جاذب عقل ونظر بنانے کے لیے ردوبدل، تحریف وتنقیص سب کچھ مباح سمجھتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اس خبر کے ساتھ میڈیا والوں نے بھی کیا۔ بجائے مکمل نیوز دینے کے خبر کو جاذب نظر بنانے کی غرض سے اجمال غیر مشروع سے کام لیا۔ اور دنیا کو یہ غلط تاثر دینے کی کوشش کی کہ جامعۃ الازہر الشریف نے نقاب پر پابندی عائد کردی ہے، جبکہ یہ سراسر غلط ہے۔ مجلس الأعلی للأزہر (AL-AZHAR SUPREM COUNCIL) کا بیان پڑھنے کے بعد میڈیا کی قلعی پورے طور سے کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مصری وزارۃ الأوقاف کی جانب سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ ''منبر الاسلام'' بابت ماہ نومبر ۲۰۰۹ء اور خود الأزہر یونیورسٹی سے شائع ہونے والا ہفت روزہ اخبار "صوت الأزہر"(Voice of Al-Azhar) میں الازہر سپریم کاؤنسل کے جنرل سکریٹری محترم جناب محمد عبدالمجید الخزرجی صاحب کا اک بیان شائع ہوا ہے جس میں حجاب کے تعلق سے الازہر کے موقف کی مکمل وضاحت ہے۔ بیان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ پردے کے متعلق الأزہر الشریف کا موقف اور نظریہ یہ ہے کہ ''عورت نقاب کا استعمال اس لیے کرتی ہے تاکہ اسے غیر محرم نہ دیکھیں، لھذا جس جگہ مرد نہ ہوں وہاں چہرہ ڈھکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ الأزہر یونیورسٹی میں چونکہ تعلیم مخلوط (Co-education) نہیں ہے ،لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام لڑکوں کے کلاس سے دور صرف الگ بلڈنگ ہی میں نہیں بلکہ لڑکیوں کا کیمپس بھی لڑکوں کے کیمپس سے علیحدہ اور کافی دور ہے جس میں صرف معلمات ہی پڑھاتی ہیں، اور وہاں مردوں کا گزر شاذ و نادر ہوتا ہے۔ اس لیے الازہر نے یہ پابندی لگائی ہے کہ طالبات کلیۃ البنات ''Girls college'' اور معهد الفتيات کے کلاس روم نیز امتحان ہال (جہاں صرف خواتین ہی گارڈ ہوں گی) کے اندر نقاب یعنی چہرا نہیں ڈھک سکتی ہیں۔ جمہور فقہانے بھی وجہ وکفین یعنی چہرا اور ہتھیلی کھولنے کی رخصت دی ہے، گو کہ بعض نے بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہونے کی قید لگائی ہے، لھذا یہاں مردوں کے عدم وجود کے سبب فتنہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ باقی اگر عام عورتیں یا خود الأزہر کی طالبات بازار، سڑک، آفس یا دیگر اماکن جہاں غیر محرم مرد موجود ہوں وہاں تو درکنار بلکہ خود گرلس کالج کے کلاس روم کے باہر اس کے گراؤنڈ میں بھی حجاب کا استعمال کریں تو الازہر اس کا ہرگز ہرگز مخالف نہیں ہے۔ اب میں قارئین کی خدمت میں الأزہر سپریم کاؤنسل کے جنرل سکریٹری کا بیان من وعن نقل کرتا ہوں:

"١- ان الدراسة فى الأزهر الشريف وفى جامعته تقوم على اتباع أحكام شريعة الاسلام التى منهجها اليسر والتوسط والاعتدال ،امتثالا لقوله سبحانه و تعالى:(يريد الله بكم اليسر ولايريد بكم العسر)ولقول رسول الله ﷺ "ان الدين يسر"۔

٢- على رأس الفضائل التى أمرت شريعة الاسلام بوجوب التحلى بها:الاعتصام بالعفاف والتستر والاحتشام۔ومن الآيات القرآنية التى أكدت ذلك قوله تعالى:(قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم ان الله خبير بما يصنعون ۔وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولايبدين زينتهن الا ماظهر منها)الوجه واليدان۔

قال فضيلة المرحوم الشيخ حسنين محمد مخلوف مفتى الديار المصرية الأسبق۔فى كتابه " فتاوى شرعية" جلد ١ ، صفحة ١١٩ :تحت عنوان "وجه المرأة ليس بعورة"۔

ثم قال :قال الامام النووى فى المجموع :(المشهور من مذهب الشافعية أن عورة لمرأة جميع بدنها الا الوجه والكفين)۔وبهذا قال الامام مالك والامام ابوحنيفة والأوزاعى،وابو ثور ،والامام أحمد فى رواية،وطائفة من الأئمة۔

٣- ان المجلس الأعلى للأزهر(AL-AZHAR SUPREM COUNCIL) ليس ضداستعمال المرأة للنقاب فى حياتها الشخصية التى تتعلق بسلوكها فى الشارع وفى عملها، وفى بيعها وفى شرائها۔ولكن المجلس الأعلى للأزهر ضد استعمال هذا الحق فى غير موضعه ممايترتب عليه غرس ذلك فى عقول الصغار من الفتيات ،واتباع رأى الأقلية المخالف لرأى الجمهور الفقهاء الذى يقول :بأن وجه المرأة ليس بعورة۔

٤-من الأمور التى يفهمها كل عاقل أن المرأة تستعمل النقاب خشية أن يراها الرجال،وليس من

المعقول أن تستعمل المرأة النقاب اذا وجدت فى مكان كله من السيدات،لأن الاصرار على استعماله فى وجود النساء هو لون من التشدد الذى تأباه شريعة الاسلام۔

٥- لهذه الأسباب واستنادا لحكم المحكمة الدستورية العليا المقيد بجدول الحكمة برقم ٨ لسنة ١٧ قضائية دستورية الصادر بتاريخ ١٨ مايو ١٩٦٦ء الموافق ٣٠ من ذى الحجة ١٤١٦ھ قرر المجلس الأعلى للأزهر،منع الطالبات والمدرسات من ارتداء النقاب داخل الفصول الدراسية الخاصة بالبنات،والتى يقوم بالتدريس فيها المدرسات من النساء فقط سواء كان ذلك فى المراحل الابتدائية أم الاعدادية أم الثانوية،وذلك حرصا على نشر الثقة والانسجام والارتياح والفهم السليم للدين بين الفتيات جميعا۔

كذلك قرر المجلس الأعلى للأزهر تطبيق ذلك بالمدن الجامعية الخاصة بالطالبات حرصا عليهن وللطالبات الراغبات فى النقاب استعماله فى بيوتهن وفى الشارع وفى ساحة المعهد الذى يدرسن فيه،والممنوع فقط هو استعماله داخل الفصل الدراسى الخاص بالبنات والذى يقوم بالتدريس فيه المدرسات من النساء فقط۔

كما أن المجلس الأعلى للأزهر ،قد قرر منع الطالبات فى جميع مراحل الدراسة فى الأزهر وفى جامعته من لرتداء النقاب فى قاعات الامتحانات الخاصة بالفتيات ،والتى لاوجود للرجال معهن فى هذه القاعات ،وتكون المراقبة عليهن أثناء الامتحان مقصورة على النساء فقط۔الأزهر وجامعته سيعملان باذن الله تعالى۔ على تحقيق كل ما يرضى الله ويحقق مصلحة الدارسات۔ونسأل الله التوفيق والسداد فى القول والعمل۔

الأمين العام للمجلس الأعلى للأزهر

محمد عبد المجيد الخزرجى "

میں سمجھتا ہوں کہ جامعۃ الأزہر الشریف کا یہ قانون شریعت مطہرہ کے حکم کے خلاف نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر الأزہر الشریف کی صدیوں پر محیط دینی وملی بالخصوص علوم اسلامیہ اور عربیہ کی گراں قدر خدمات کو فراموش کرکے طعن وتشنیع کی جائے۔ ہاں! البتہ اس مسئلے میں الأزہر کے ارباب حل وعقد خصوصا شیخ الأزہر محمد سید طنطاوی صاحب قبلہ سے اتنی گزارش ضرور کی جاسکتی ہے کہ جس طرح جامعۃ الأزہر میں برسہا برس سے مسئلۂ حجاب طالبات کی اپنی صواب دید اور مرضی پر متروک تھا (خواہ نقاب کا استعمال کریں یا نہ کریں) ویسے ہی اس معاملے کو برقرار رکھنا قرینۂ مصلحت تھا، لہٰذا اگر اسی پر عمل ہو تو اچھا ہوگا۔☆☆☆

(ص:۱۳ کا بقیہ)......تاکہ وہ اپنے دین پر بآسانی عمل کرسکیں۔ ساتھ ہی اردو زبان سے اتنی آگاہی اور دلچسپی پیدا ہوجائے کہ وہ مزید مطالعہ کرکے اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرسکیں۔

(۲) براہِ راست قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے کے لیے عربی زبان سے آگاہی ضروری ہے اور عربی سیکھنے کے لیے صرف ونحو اور لغت وادب کی معرفت لازم ہے۔ اس ذریعہ کو آسان سے آسان اور کم سے کم مدت میں سر کرانا چاہیے۔ اسی کو مقصود بنا کر اس پر زیادہ وقت صرف کرانا آج کسی طرح قرین حکمت ومصلحت نہیں۔ ہاں ضروری نصاب کی تکمیل کے بعد ان علوم آلیہ میں سے کسی علم پر اگر کوئی تحقیق کرے اور اس میں امتیاز واختصاص پیدا کرے تو بجا ہے۔

(۳) تنظیم المدارس کے نصاب کے مطابق درجۂ عالمیت تک کی تعلیم تمام طلبہ کو مکمل دی جائے پھر فضیلت کا دوسالہ نصاب اس طرح ہو کہ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، کلام وغیرہ میں سے کسی ایک کا غلبہ اور بقیہ کی شمولیت ضروری حد تک ہو یعنی اس نصاب کو متعدد شعبوں میں تقسیم کردیا جائے اور ہر شعبہ میں کسی ایک فن کو اصلی اور باقی کو ضمنی کی حیثیت دی جائے تو مختلف علوم وفنون کے ماہرین پیدا ہوسکیں گے۔ اس میں مضامین اور شعبوں کی کثرت کے باعث زیادہ اساتذہ کی ضرورت پیش آئے گی جو بہت مشکل امر ہے۔ اس لیے چند مدارس مل کر اگر شعبوں کی باہم تقسیم کرلیں تو آسانی ہوسکتی ہے، ورنہ بروقت جو نصاب ہے وہی جاری رکھا جائے۔

(۴) فضیلت کے بعد اختصاص کا دوسالہ کورس مناسب ہے، اسے مزید مستحکم اور زیادہ فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح زیادہ شعبوں میں اختصاص کے انتظام کی صورت بھی پیدا ہونی چاہیے۔

الغرض بہتری کی شکلیں بہت ہیں لیکن ذمہ داران مدارس میں جب تک فکر ونظر اور ہمت وحوصلہ کی بلندی نہ پیدا ہو کوئی کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان میں فکری وعملی بیداری پیدا کی جائے اور انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ آپ تعلیم کا چھوٹے سے چھوٹا اور محدود سے محدود کام بھی اگر کررہے ہیں تو اسے منظم، مضبوط اور زیادہ نتیجہ خیز بنائیں۔ محض رسمی خانہ پری سے بے شمار صلاحیتیں ضائع ہورہی ہیں جب کہ مسلمانوں میں تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہے اور مدارس کی طرف رخ کرنے والوں کی تعداد تو کم سے کم تر ہے۔ اگر گنتی کے یہ چند افراد بھی کارآمد نہ بنائے گئے تو دین وملت کا عظیم اور سنگین خسارہ واضح ہے۔ وما علینا الا البلاغ ☆☆

آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کی تشکیل

وفد کی مرکزی وزیر کپل سبل سے ملاقات

مولانا خوشتر نورانی

مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے ہماری غفلت کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، ہمارا دعویٰ تو اکثریت کا ہے مگر ہر شعبے میں ہمارا وجود آٹے میں نمک کے برابر ہے، گزرے دنوں میں بھی زبان وقلم سے اپنی بے حسی اور جمود کا ماتم کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ برف اب تک پگھل نہیں سکی ہے، اس کی وجہ ہمارا تقلیدی مزاج ہے، مسلکی اور مشربی طور پر ہمارے مزاج کو جس سانچے میں ڈھالا گیا ہے، اس میں انفرادی حرکت کا کوئی تصور نہیں ہے، ہم ٹک ٹکی باندھے اپنے معروف قائدین اور رہنماؤں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ ان مسائل میں کیا ارشاد فرماتے ہیں، تا کہ ہم ان کی تقلید میں آگے بڑھ سکیں، مگر انہیں اپنے حلوے مانڈے سے ہی فرصت نہیں ہے، ان مسائل پر توجہ دیں بھی تو کیسے؟ حالیہ دنوں وندے ماترم، لبراہن کمیشن اور مرکزی مدرسہ بورڈ کے تعلق سے ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے قائدین اور لوگوں نے آوازیں بلند کیں اور ان کے بیانات اخباروں کی سرخیاں بنتے رہے، حکومت تک ان کے مسائل پہنچتے رہے اور ان کے موقف پر رائے عامہ ہموار ہوتی رہی، مگر ان مسائل میں ملک گیر سطح پر ہماری طرف سے اکا دکا آواز کے علاوہ نہ کچھ سنائی دیا، نہ دکھائی دیا- ہاں! ہمارے قائدین کی آوازیں ملکی پیمانے پر مذہبی میڈیا اور مذہبی اجلاس میں کثرت سے سنائی اور دکھائی اس وقت دیتی ہیں جب ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، پھر یہ مسئلہ ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دین ومسلک کی عزت وآبرو کا مسئلہ بن جاتا ہے اور ان کے سدھائے ہوئے ورکرز میدان کارزار میں کود پڑتے ہیں- پھر تو یہ گنہگار آنکھیں یہ بھی دیکھتی ہیں کہ امت کے نہایت اہم اور اجتماعی مسئلے پر جس قلم کو دو سطر لکھنے کی فرصت نہیں رہتی، ان کی اپنی ذات کا مسئلہ ان کے قلم میں وہ سرعت پیدا کر دیتا ہے کہ ہر پندرہ دنوں میں سیکڑوں صفحات پر مشتمل ایک کتاب منظر عام پر آتی ہے اور قوت گویائی اتنی بلند اور سرحد ادراک سے اتنی نکل جاتی ہے کہ کانوں کو سننے کی تاب نہیں رہتی- شخصی عقیدتوں سے پرے ہو کر ملت کے اہم مسائل پر ہم توجہ دیں اور اپنا مزاج تبدیل کریں تو بات بن سکتی ہے اور ہمارا اقلیتی وجود اکثریت میں تبدیل ہوسکتا ہے، ورنہ زبان وقلم کب تک گلے کرتے رہیں گے؟

۷ر نومبر ۲۰۰۹ء کو عرس قاسمی مارہرہ مطہرہ میں دوسری کل ہند ''فکر وتدبیر کانفرنس'' زیب سجادہ آستانۂ برکاتیہ حضرت امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد معروف علما، مشائخ، اہل قلم اور دانشوران شریک ہوئے، اس کانفرنس میں ''مسلم معاشرے میں تعلیم کے تصورات: مسائل، حل اور امکانات'' کے موضوع پر اجتماعی غور و خوض کیا گیا اور وہ تجاویز اتفاق رائے سے منظور کی گئیں جن سے مسلم معاشرے میں تعلیم کا فروغ ہوسکتا ہے- تعلیمی امور سے متعلق ان تجاویز پر عملی اقدام کے لیے بشمول البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ بہت سے اداروں نے اپنی خدمات پیش کیں-

اس کانفرنس میں سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ عمومی طور پر ملی مسائل پر غور وفکر اور خصوصی طور پر مرکزی مدرسہ بورڈ پر اپنا موقف طے کر کے حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک تنظیم بنام ''آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی'' تشکیل دی گئی، جس کا اعلان حضرت امین ملت کے حکم سے حضرت شرف ملت سید محمد اشرف قادری مدظلہ العالی نے کیا اور اس کمیٹی کا صدر مولانا محمد احمد مصباحی صاحب صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اور کنوینر مولانا مبارک حسین مصباحی کو نامزد کیا اور حکم دیا کہ فکر وتدبیر کانفرنس کے اختتام پر مرکزی بورڈ کی تشکیل کے سلسلے میں اپنا موقف طے کرنے کے لیے چند مخصوص علما اور دانشوران ایک میٹنگ کر لیں- حکم کے مطابق بعد نماز مغرب مولانا محمد احمد مصباحی صاحب کی صدارت میں میٹنگ کا آغاز ہوا، جس میں خصوصی طور پر مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا ادریس بستوی، مولانا مبارک حسین مصباحی، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، مولانا اسید الحق قادری، الحاج محمد سعید نوری، نوشاد عالم چشتی، مولانا اعجاز انجم لطیفی، مولانا صغیر اختر مصباحی، مولانا صغیر جوکھن پوری اور راقم نے شرکت کی- اس میٹنگ میں اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ حکومت کی جانب سے تیار کردہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے قانونی مسودے کو چار افراد بغور مطالعہ کریں اور اس میں مدارس کے حق میں قابل اعتراض دفعات کی نشاندہی کر کے اگلی میٹنگ میں رکھیں اور مسودے میں ترمیم کیے ہوئے حصے کو تیار کر کے اہل سنت و جماعت کا ایک وفد مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل سے ملاقات کرے اور ممکنہ ترمیمات کے ساتھ مرکزی مدرسہ بورڈ بل کی حمایت کا اعلان کرے- اس میٹنگ کے بعد اہل سنت کی کچھ تنظیموں اور افراد نے بھی مرکزی بورڈ کی حمایت میں میڈیا میں بیانات دیے، میٹنگیں کیں اور اجلاس بھی منعقد کیے، خصوصی طور پر ۵ار نومبر کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید کے صدر مولانا توقیر رضا خاں نے غالب اکیڈمی دہلی میں اس حوالے سے ایک کنونشن کیا اور اپنی حمایت کا اعلان کیا، اسی طرح ۷ار نومبر کو ممبئی میں مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کی کوششوں سے الحاج محمد سعید نوری نے رضا اکیڈمی کے زیر اہتمام علما ومشائخ پر مشتمل ایک نشست کی اور امین شریعت ایجوکیشنل ٹرسٹ گجرات نے ۲۲ر نومبر کو غالب اکیڈمی دہلی میں اپنا اجلاس منعقد کیا-

اہل سنت و جماعت کی جانب سے اس خوشگوار پہل اور سرگرمی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قومی میڈیا اور حکومت ہماری طرف متوجہ ہوگئی، جس کے نمایاں اثرات دیگر مکاتب فکر کے اجلاس وبیانات میں نظر آئے-

آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کی دوسری میٹنگ: مارہرہ مطہرہ میں آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کی پہلی میٹنگ کے بعد ۱۸ر نومبر ۲۰۰۹ء کو اس کی دوسری میٹنگ البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں حضرت امین ملت کی صدارت میں منعقد ہوئی- مسودے میں اپنی اپنی ترمیمات کے ساتھ مولانا محمد احمد مصباحی صاحب، مولانا مبارک حسین مصباحی، راقم خوشتر نورانی، ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی کوآرڈی نیٹر البرکات، ڈاکٹر محب الحق اور نوشاد عالم چشتی شریک ہوئے- اس میٹنگ میں مرکزی مدرسہ بورڈ بل ۲۰۰۹ء کے مسودے میں متفقہ طور پر ۹ر دفعات میں ترمیمات کی گئیں جو مدارس کو مزید تحفظ فراہم کر سکیں، ترمیمات کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مرکزی مدرسہ بورڈ بل ۲۰۰۹ء کا مقصد ''مدارس میں غیر مذہبی تعلیم کی معیار بندی'' کی بجائے ''مدارس میں مدرسہ تعلیم کی معیار بندی'' کیا جائے-

(۲) بورڈ کا نام مرکزی مدرسہ بورڈ کی بجائے ''مرکزی مدرسہ ایجوکیشنل بورڈ'' رکھا جائے-

(۳) مرکزی مدرسہ بورڈ سے مدارس کو الحاق کی منسوخی کا اختیار ہونا چاہیے-

(۴) بورڈ کی نصاب کمیٹی سے بورڈ کے ممبران کے علاوہ ''دیگر افراد'' کی شرط خارج کی جائے-

(۵) مرکزی مدرسہ بورڈ کا چیرمین اور رجسٹرار مسلمان ہونا چاہیے-

(۶) مرکزی مدرسہ بورڈ سے تمام الحاق شدہ مدارس کو لازمی طور پر مالی امداد کی منظوری ملنی چاہیے-

(۷) مدارس کے جو اساتذہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے ذریعے تدریسی ٹریننگ لے لیں، انہیں عربی فارسی اور دینیات میں B.ed کے مساوی قرار دیا جائے-

(۸) مرکزی مدرسہ بورڈ بل 2009ء کے اندر باب ۴ر میں (L) سے (q) اور (w) دفعات کو تین چوتھائی بورڈ کے ممبران کے ذریعے نافذ کیے جانے کی شرط لازمی ہو-

(۹) مرکزی بورڈ سے ملحقہ مدارس کے دینی اساتذہ کو عربی فارسی اتر پردیش بورڈ کی طرح تنخواہیں ملنی چاہیے-

اس میٹنگ میں آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کو مستحکم کرنے کے لیے ہندوستان سے مندرجہ ذیل افراد کا انتخاب کیا گیا تا کہ ملی مسائل پر ٹھوس اقدام کیا جا سکے اور مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی تحریک کو ملک گیر سطح پر موثر بنایا جائے:

سرپرست اعلیٰ: حضرت امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں برکاتی (سجادہ نشین خانقاہ عالیہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ)

سرپرست: حضرت مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں (سجادہ نشین خانقاہ رضویہ، بریلی)

سرپرست: عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبدالحفیظ صاحب

(سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور)
صدر: مولانا محمد احمد مصباحی
(صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور)
نائب صدر: مولانا یٰسین اختر مصباحی (بانی دار القلم دہلی)
مولانا سید محمد اشرف کچھوچھوی
(صدر: علماء و مشائخ بورڈ، کچھوچھہ)
مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری
(ولی عہد: خانقاہ عالیہ قادریہ، بدایوں)
جنرل سکریٹری: ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی
(کوآرڈی نیٹر: البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ)
کنوینر: مولانا مبارک حسین مصباحی
(مدیر اعلیٰ: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور)
ترجمان: خوشتر نورانی (مدیر اعلیٰ: ماہنامہ جام نور دہلی)
ممبرز: ڈاکٹر خواجہ اکرام (ایسوسی ایٹ پروفیسر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی)
الحاج محمد سعید نوری (چیرمین: رضا اکیڈمی، ممبئی)
مولانا سید تنویر ہاشمی (صدر: الہاشم ٹرسٹ، بیجاپور، کرناٹک)
ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم (صدر شعبۂ اسلامیات، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)

وفد کی مرکزی وزیر کپل سبل سے ملاقات: میٹنگ میں طے شدہ ایجنڈے کے مطابق محترم جناب عبد العلی عزیزی ممبر نیشنل کمیشن فار بیک ورڈ کلاسیز کی کوششوں سے ۳ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل سے اہل سنت و جماعت کے وفد کی ملاقات کا وقت لیا گیا اور پھر مذکورہ ترمیمات کے ساتھ مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی حمایت میں مقررہ تاریخ کو حضرت امین ملت کی قیادت میں اہل سنت کے ایک وفد نے ملاقات کی، جس کی تفصیل ہندوستان کے مختلف اخباروں میں اس طرح آئی:

''آج 3ر دسمبر 2009ء کو'' آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی'' کے ایک وفد نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل سے ملاقات کی اور وزیر موصوف کو مرکزی مدرسہ بورڈ کے تعلق سے اپنے خیالات سے واقف کرایا۔ جناب کپل سبل نے وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایسا پہلا موقع ہے جب مسلمانوں کا ایک باشعور طبقہ مجھ سے ملاقات کر کے مرکزی مدرسہ بورڈ میں ترمیم کے ساتھ اسے منظوری دینے کی اپیل کر رہا ہے، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ترمیم کے حوالے سے پیش کی گئی آپ کی تجاویز پر غور کیا جائے گا۔ وفد کی قیادت کر رہے آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر سید محمد امین برکاتی صدر البرکات ایجوکیشن سوسائٹی علی گڑھ نے جناب کپل سبل کو مبارک باد دی کہ ان کی وزارت مدارس کی تعلیم کو بھی اہمیت دے رہی ہے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے ایک مرکزی بورڈ کی تشکیل دینا چاہ رہی ہے۔ پروفیسر سید محمد امین نے جناب کپل سبل کو آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کی جانب سے اپنا مکتوب اور مدرسہ بورڈ میں ترمیم کے حوالے سے تجاویز سونپتے ہوئے کہا کہ'' آپ کی کوششوں سے حکومت کو یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ یہ بل ترمیم کے ساتھ منظوری کے لیے جلد از جلد پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور اس پر بلا وجہ سیاست نہ کی جائے''۔ آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے نائب صدر مولانا اسید الحق قادری ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں نے کہا کہ'' اس بورڈ میں شمولیت یا عدم شمولیت کا اختیار جب مدارس کو حاصل ہے تو پھر بلا وجہ اس کو مدارس کے خلاف سازش، مدارس میں مداخلت کی کوشش اور اس طرح کی باتیں کرنا سراسر فضول ہے۔ مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض سیاسی سورما اپنے مفاد کے لیے اس پر سیاست کر رہے ہیں۔ حکومت کو ان کے شور و غوغا کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے اور یہ بل جو مدارس کے احیا اور فروغ کے حوالے سے ہے اسے منظوری دی جانی چاہیے''۔ آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے کنوینر مولانا مبارک حسین مصباحی جنرل سکریٹری تنظیم ابنائے اشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ نے کہا کہ'' چند مذہبی سیاسیوں کو چھوڑ کر پورا ہندوستان اس بل کی موافقت میں ہے۔ تمام مسلم دانشوران اور علما اس کی تائید کر رہے ہیں۔ ایک دو بڑے مدارس کے علاوہ ہر مسلک اور مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما اور دانشوران اس کی حمایت میں ہیں، اس لیے حکومت اس بل پر سیاست کر کے مسلمانوں کو محروم نہ کرے، بلکہ یہ کام اسے ضرور کرنا چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر ہم اس کی تائید میں پورے ہندوستانی مسلمان کو کھڑا کر سکتے ہیں''۔ آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی

کے وفد نے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل کو جو میمورنڈم دیا اس میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے موجودہ بل میں بعض ضروری ترمیمات کا مطالبہ کیا گیا تھا، ان مطالبات میں سے چند اہم یہ ہیں:

(۱) مرکزی مدرسہ بورڈ سے مدارس کو الحاق کی منسوخی کا اختیار ہونا چاہیے۔
(۲) بورڈ کی نصاب کمیٹی سے بورڈ کے ممبران کے علاوہ ''دیگر افراد'' کی شرط خارج کی جائے۔
(۳) مرکزی مدرسہ بورڈ کا چیرمین اور رجسٹرار مسلمان ہونا چاہیے۔
(۴) مرکزی مدرسہ بورڈ سے تمام الحاق شدہ مدارس کو لازمی طور پر مالی امداد کی منظوری ملنی چاہیے۔
(۵) مدارس کے جو اساتذہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے ذریعے تدریسی ٹریننگ لے لیں، انہیں عربی فارسی اور دینیات میں B.ed کے مساوی قرار دیا جائے۔
(۶) مرکزی مدرسہ بورڈ بل 2009ء کے اندر باب ۴ر میں (L) سے (q) اور (w) دفعات کو تین چوتھائی بورڈ کے ممبران کے ذریعے نافذ کیے جانے کی شرط لازمی ہو۔
(۷) مرکزی بورڈ سے ملحقہ مدارس کے دینی اساتذہ کو عربی فارسی اتر پردیش بورڈ کی طرح تنخواہیں ملنی چاہیے۔

آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کے ترجمان مولانا خوشتر نورانی چیف ایڈیٹر ماہنامہ جام نور دہلی نے کہا کہ'' یہ موقع مدرسہ ایجوکیشن کے فروغ اور اصلاح کا ہے۔ بعض افراد اس کو مسلک اور فرقہ بندی سے جوڑ رہے ہیں، جب کہ یہ خالص مسلمانوں کے فائدے کا سوال ہے۔ حکومت اگر چند لوگوں کی وجہ سے بورڈ کی تشکیل نہیں کرتی، تو ہم سمجھیں گے کہ بورڈ کی تشکیل کے سلسلے میں حکومت کی نیت صاف نہیں تھی اور وہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ ہمارا وفد اس سلسلے میں بہت جلد وزیر اعظم مسٹر منموہن سنگھ اور محترمہ سونیا گاندھی سے بھی ملاقات کرے گا۔ وفد میں کوآرڈینیشن کمیٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی، ڈاکٹر خواجہ اکرام ایسوسی ایٹ پروفیسر جے این یو نئی دہلی اور عبد العلی عزیزی ممبر نیشنل کمیشن فار بیک ورڈ کلاسیز بھی شامل تھے۔

آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی مرکزی مدرسہ بورڈ کے تعلق سے مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنے اور اس تعلق سے پیدا شدہ خدشات اور غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے بہت جلد ملک کے مختلف شہروں میں اجلاس کا انعقاد کرنے جا رہی ہے۔''

(ہمارا سماج، ہندوستان ایکسپریس، راشٹریہ سہارا، دہلی، ہندوستان، دینک جاگرن، بریلی)

اگلا قدم: آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی اگلے قدم کے طور پر مرکزی مدرسہ بورڈ بل ۲۰۰۹ء کے مسودے میں اپنی ترمیمات کو ایک مکتوب کے ساتھ تمام مسلم ممبران پارلیمنٹ اور ہندوستان کے مدارس کے ذمہ داروں کو ارسال کر رہی ہے تاکہ بورڈ کی تشکیل کے سلسلے میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کے ذریعے اپنی آواز کو پارلیمنٹ میں پہنچائی جا سکے اور مسلکی سطح پر جماعت اہل سنت کا موقف واضح اور ایک ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کی ہمواری کے لیے کمیٹی مختلف صوبوں میں اپنا اجلاس بھی کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

مجھے آج یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے تئیں اہل سنت میں جو عمومی بیداری آئی ہے وہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کی بافیض پہل کا نتیجہ ہے، اگر جماعت کو تمام مسائل میں ان کی یونہی سرپرستی ملتی رہے تو ماضی کی تمام تساہلی اور غفلت کا مداوا ہو سکے گا۔ ☐☐☐☐

سنہری موقع
ماہنامہ اشرفیہ کی گزشتہ جلدیں خوب صورت
ہارڈ کور کے ساتھ دستیاب ہیں
بارہ شمارے ایک ہی جلد میں
قیمت صرف -- 150 روپے
..........رابطہ..........
دفتر ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور

ادبی تنقید کا اسلامی نقطۂ نظر

''**بزمِ دانش**'' میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم اربابِ قلم اور علماے اسلام کو آواز دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ **از: مبارک حسین مصباحی**

فروری ۲۰۱۰ء کا عنوان	نکسلائٹ تحریک: ملکی امن و استحکام کے لئے سب سے بڑا چیلنج
مارچ ۲۰۱۰ء کا عنوان	ملی مسائل اور ہماری بے حسی

معلمِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تنقید کا اخلاقی و روحانی تصور پیش کیا

زبان و بیان کی عزت و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ رب کریم جل مجدہ نے ''تعلیمِ بیان'' کی نسبت اپنی ذات ستودہ صفات کی طرف کی ہے۔ ارشاد ناطق ہے: ''علمه البيان'' اور اسے بیان سکھایا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور کائنات کا ہر حسن و جمال اس کے دستِ قدرت کا شاہ کار ہے۔ انسان پوری کائنات اور مخلوقات کا امام بن کر آیا ہے اور اس کے سر پر کرامت کا تاجِ زریں رکھا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ''ولقد كرمنا بني آدم'' اور ہم نے بنی آدم کو کرامت والا بنایا۔ اس کی کرامت و امامت کی دو بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک ہے عقل اور دوسری ہے نطق، یہ دونوں گراں بہا نعمتیں انسان کا خاصہ اور لازمہ ہیں۔ انسان جیسی عظیم مخلوق کو خداے ذوالجلال نے یوں ہی نہیں فرمادیا۔ شے جس قدر عظیم ہوتی ہے اس کا مقصد بھی اتنا ہی عظیم ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو متعدل اور متوازن بنانے کے لئے خداوند قدوس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انبیاء و مرسلین کا مقدس سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ بلکہ تمام انسانوں کو ایک نبی حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پشت سے پیدا فرمانا منظور کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جملہ انسان ایک نبی کی اولاد ہیں۔ اس تصور ہی سے انسان بلندیوں کی ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں تک رسائی کا کوئی حیوان تصور بھی نہیں کرسکتا۔ آج انسانی دنیا کے پاس مظاہرِ تہذیب و تمدن، وسائلِ تجارت و معیشت، اسبابِ راحت و آسائش اور علم و فکر کا جو خزانہ ہے وہ بھی انھیں انبیاے کرام کا ورثہ اور عطیہ ہے۔ بالخصوص زبان کے بارے میں قرآن مجید نے ارشاد فرمایا: ''وعلم آدم الاسماء كلها۔'' اور آدم کو سکھائے اشیا کے نام۔ علما نے فرمایا یہاں اسما سے مراد مسمیات بھی ہیں اور ان کا مفاد انسانی علوم و فنون ہیں۔ چناں چہ اربابِ فکر و نظر کا ماننا ہے کہ دنیا میں رائج تمام زبانوں کے موجد اور ''معلم اول'' حضرت سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی ہیں۔

آج زبانیں ارتقا و بلندی کی جس معراجِ کمال پر ہیں وہاں بیک وقت نہیں پہنچ گئیں۔ کائنات میں کارفرما ارتقا کی ہزاروں منزلوں سے گزر کر ہی وہاں پہنچی ہیں۔ انبیاے کرام کی مقدس جماعت نے جہاں عام انسانوں کو دنیاوی کاروبار کی تعلیم فرمائی وہیں زبان و بیان پر بھی ان کے عظیم اور ناقابلِ انکار احسانات ہیں۔ گویا زبان و بیان کا سرچشمہ بھی انبیاے کرام کی مقدس ذوات ہی ہیں۔ لہٰذا ہمیں زبان و بیان کے صحت و سقم اور رطب و یابس اور حسن و قبح کا اگر کوئی فیصلہ لینا ہے تو ان مقدس ہستیوں کی تعلیم و افکار سے ہٹ کر کسی فیصلہ کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

محولہ عنوان تھا ''ادبی تنقید کا اسلامی نقطۂ نظر'' مگر تمہیدی گفتگو ذرا زیادہ وسیع پس منظر میں کی گئی تا کہ کلیۃً وہ تمام شکوک و شبہات ہی

ختم ہو جائیں جنھیں مادیت زدہ طبقہ اکثر و بیشتر ادب و تنقید کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ گویا زبان پر کسی ایسی کسوٹی کو کسا نہیں جاسکتا جو انبیاے کرام کی مقدس تعلیمات و افکار سے متصادم ہو۔ جہاں تک مادی اور مغربی افکار و نظریات کا تعلق ہے تو ہم انھیں نظریات نہیں بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ انبیاے کرام کے مقدس ورثہ میں لگ جانے والا گرد و غبار بلکہ کچرا تصور کرتے ہیں۔ انسان زیادہ دنوں تک انبیاے کرام کی تعلیمات پر کاربند نہ رہ سکا۔ وقت گزرتا گیا، شخصیتیں نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئیں اور ان کی گرفت لوگوں کی زندگی سے ڈھیلی پڑتی گئی اور غیر نبوی بلکہ غیر روحانی اقدار و آثار، امراض کی شکل میں قوموں کی زندگی کا حصہ بنتے گئے۔ اسی طرح زبان و بیان کے لیے بھی غیر آسمانی اقدار و احساس کسوٹی کی شکل اختیار کرتے گئے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے ماقبل نبی حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے میں تقریباً پانچ سو سالوں کا فاصلہ رہا ہے۔ علما و مورخین بلکہ فقہا و مفکرین اس فاصلہ کو ''زمانۂ فترت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور انبیا کی انتہائی محدود سطح پر انسانی زندگی میں مذہبی اور سماجی سطح پر رونما ہونے والی چند تبدیلیوں کا تذکرہ کرکے اس باب کا خاتمہ کردیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق صرف چند مذہبی مراسم ہی میں نہیں واقع ہوا تھا بلکہ قوموں کا مجموعی مزاج اور خمیر، بلکہ فکر اور خمیر بھی بدل گئی تھی۔

اگر مغربی افکار اور آرا کا ذرا وسیع تاریخی تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیش تر نے اپنی جڑوں کو انسانی زندگی میں اسی ''عرصۂ فترت'' میں گہرا کیا تھا۔ اسی لیے اس دور کو ''قرونِ مظلمہ'' (Dark Age) کہا جاتا ہے۔ یہ تاریکی صرف عام زندگی کے مسائل میں نہ تھی بلکہ علوم و فنون اور فکر و نظر کی دنیا میں بھی فزوں تر تھی۔

اب تک کی گفتگو سے یہ بات طے ہوگئی ہے کہ زبان و بیان کی تہذیب و تنقید کے باب میں ''مغربی نظریات'' کو تاریخی نقطۂ نظر سے ایک قزاق سے زیادہ حیثیت حاصل نہ رہی۔ انھوں نے انبیاے کرام کی عطا کردہ پاکیزہ وراثت پر ہی حملہ کیا۔ البتہ جب دوسرے انبیاے کرام تشریف لاتے تو ان کی اجارہ داری کو گہن لگ جاتا۔ اب بات صرف اتنی باقی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کا کیا معیار ہونا چاہیے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ جو عظیم فرق پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد اور ماقبل کے زمانوں میں پایا جاتا ہے، وہی فرق تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی محسوس کرنا چاہیے۔ جس طرح آپ کی آمد نے انسانی زندگی کو یک لخت بدل کر رکھ دیا اور خیر و شر کا معیار بدل دیا۔ اسی طرح سوچنے اور سمجھنے کا انداز و اطوار بھی بدل گیا۔ اس سلسلے میں پہلا کریڈٹ تو سیدھے قرآن کو جاتا ہے جو ایک زندہ جاوید معجزہ ہے۔ وہ ایک ایسے اسلوب میں انسانی ذہن و دماغ کو خطاب کرتا ہے جسے سن کر انسان بھونچکارہ جاتا ہے اور اس کی تحدی تو گجا اس کے فہمِ کامل سے بھی عاجز و قاصر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے فکر و نظر کا ایک تقلیدی نظریہ پیش کیا۔ مثلاً اہلِ عرب کو اپنی شاعری پر ناز تھا، ایسی شاعری جس پر انسانی شرافت بھی آہ بھرتی نظر آتی، کبھی کسی کی آبرو نیلام ہوتی تو کبھی کسی کی پگڑی اچھالی جاتی اور اس طرح جنگوں کا سلسلہ شروع ہوتا جس کا ایندھن درجنوں انسانی قبیلے بن جاتے۔ قرآن نے نقد عن لگائی اور ارشاد فرمایا: ''والشعراء يتبعهم الغاوٗن'' شعرا کی صرف گمراہ لوگ ہی اتباع کرتے ہیں۔ وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں، وہ کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ زبان کا عمل کے مطابق ہونا ہی زبان دانی کا اصل معیار اور وقار ہے اور ادب کی اصلی روح ہے۔ اس طرح سے عربی شاعری میں جھوٹ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا۔

اس قرآنی تصور کا یہ اثر ہوا کہ جو شعرا حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے وہ دوبارہ یاوہ گوئی سے توبہ کرلیتے۔ اگر وہ شاعری بھی کرتے تو صرف حمد و صلوٰۃ کے موضوع پر کرتے، تصورِ آخرت پیش کرتے۔ حضرت حسان بن ثابت کے بارے میں یہ تواتر سے ثابت ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے اپنی شاعری کو یک لخت لگام دے دی تھی۔ دورِ جاہلی کی بدمستی کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا اور جب بھی شاعری کی وادی میں قدم رکھا تو نعتِ رسول کا گل دستہ لے کر ہی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے۔ خود آقاے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ مسجدِ نبوی کی تعمیر کے موقع کے علاوہ کبھی بھی آپ نے کوئی شعر وردِ زبان نہ کیا۔ خود قرآن کریم نے آپ کی پاکی بیان کرتے ہوئے اس طرح گواہی دی: ''ما علمناه الشعر وما ينبغي له۔'' ہم نے انھیں شعر نہ سکھایا اور نہ یہ ان کے شایانِ شان ہے۔ اس آیت سے اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کا کیا معیار ہونا چاہیے اور ایسا بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ معاذ اللہ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم زبان و بیان کے دشمن تھے یا آپ کو اس سے ذہنی مناسبت نہ تھی۔ بلکہ سچائی یہ ہے کہ آپ افصح العرب تھے۔ خود ارشاد فرمایا: ''أنا أوتيت جوامع الكلم۔'' مجھے جامع کلمے اور حکمتیں عطا کی گئیں۔ آپ

کے ارشاداتِ عالیہ کو عربی زبان وادب کی تاریخ میں قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ فصیح وبلیغ کلام کا درجہ حاصل ہے اور یہ صرف عقیدت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ٹھوس ادبی حقیقت پر مبنی ہے۔ دراصل آپ نے زبان وبیان کی تنقیح وتہذیب یعنی تنقید کا ایک نیا اور مستقل اخلاقی وروحانی بلکہ الٰہی تصور پیش فرمایا جس میں نہ کسی کی ایذا رسانی ہو اور نہ خدائے قدیر وجبار کی نعمتوں کا انکار ہو۔ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت نابغہ ــــــــؓ نے کہا۔

بلغنا السماء مجد نا وجد ودنا   و انا لنرجوا فوق ذٰلک مظهرا

تو فوراً ہی آقائے کریم ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ارشاد فرمایا: "الی این یا ابا لیلیٰ؟" تو انھوں نے فوراً فرمایا: "الی الجنة یا رسول الله." "اس سے آگے جنت مطلوب ومقصود ہے۔ اس طرح ایک الجھا ہوا کلام فوراً نبوی ذوق کی کسوٹی پر کھرا ہو گیا۔

ایک بار آقائے کریم ﷺ نے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار کو سنا تو فرمایا: "آمن لسانه و كفر قلبه." "زبان اس کی مومن ہے اور دل اس کا کافر ہے۔ صحیح اسلامی تنقیدی نقطۂ نظر کو سرکار کے اس ارشادِ مبارک سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے جو آپ نے انسانی طبائع کے متعلق ارشاد فرمایا تھا: "الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خيارهم فى الجاهلية خيارهم فى الاسلام اذا فقهوا." "لوگ سونے اور چاندی کے کان کی طرح ہیں جو دورِ جاہلیت میں بہتر تھا وہ قبولِ اسلام کے بعد بھی بہتر رہا۔ یعنی جس طرح سونا یا چاندی جو کان میں اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے وہ پگھلانے کے بعد اور بھی نکھر اور نتھر جاتا ہے اسی طرح انسانی طبیعتوں کا معاملہ ہے۔ یہاں اس سوال کا بھی جواب ہو گیا کہ اسلام صلاحیتوں کو سلب کرتا ہے۔ اسلام صلاحیتوں کو سلب نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی اصلاح کرتا ہے، لیاقتوں کو نکھارتا ہے اور صحیح انسانی قدروں کے سانچے میں ڈھال کر ایک اچھا انسان بناتا ہے۔ اسی لیے: "اذا فقهوا." فرمایا یعنی مگر شرط یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ گویا تمام طرح کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے اجاگر ہونے کی بنیادی شرط دین کی سمجھ ہی ہے۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے جو بھی کلام پیش کیا جائے گا یا جو بھی شاعری پیش کی جائے گی وہ قابلِ قبول ہوگی۔

اصمعی نے اپنی بعض تحریرات میں لکھا ہے کہ: "الشعر اذا دخل فى الخير ضعف و اذا دخل فى الشر قوى." "شعر جب تک شر کے میدان مین طبع آزمائی کرتا ہے تو توانا ہوتا ہے اور جب پند وموعظت میں داخل ہوتا ہے تو کم زور پڑ جاتا ہے۔ یہ اسلام اور اس کے نظریات پر ایک شدت پسندانہ حملہ کے سوا کچھ نہیں۔ ضروری نہیں کہ ہم تنقید نگاروں کی ہر بات کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیں۔ دراصل بعض صحابۂ کرام کے قبولِ اسلام کے بعد گوشہ نشینی اور عبادت وریاضت کی طرف ان کے جھکاؤ سے یہ غلط رائے قائم کی گئی، ورنہ حضرت حسان بن ثابت نے قبولِ اسلام کے بعد جو اشعار مدحتِ مصطفیٰ ﷺ میں کہے ہیں، لسانی وادبی نقطۂ نظر سے ان کی قدر وقیمت مطلق کم نہیں ہوتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسلامی تنقیدی کسوٹی پر کھرے اترتے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ غلط فہمی کی پشت پر قصیدہ "بانت سعاد" یقیناً تازیانہ ثابت ہوگا جس میں شاعرِ اسلام حضرت کعب بن زہیر نے بھرپور طریقے سے تشبیب کے اشعار کہے ہیں اور عربوں کی پسندیدہ زمین میں اونٹنی کی ایسی منظر نگاری کی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود انھیں دربارِ نبوت سے "ردائے مبارک" عطا کی جاتی ہے اور ان کو دعاؤں سے نوازا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شاعر یا ادیب اگر اسلام کے مطلوبہ اخلاقی معیار کو برتتے ہوئے اشاراتی اور کنائی زبان میں محاسن کو اجاگر کرتا ہے تو قطعاً قابلِ گرفت نہیں۔ اسی طرح سے تنقید اسلامی نقطۂ نظر سے ایک پاکیزہ تصور رکھتی ہے، اگر اسے برتا جائے تو معاشرے کی تخریب کے بجائے اس کی تعمیر عمل میں آئے گی اور ذہن وفکر پراگندہ ہونے کے بجائے آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہوگا۔ ادب انسانی ذہن وفکر کا پرتو ہوتا ہے۔ ذہن جس قدر پاکیزہ ہوگا ادب اسی قدر سنہرا اور خوب رو ہوگا۔ مغربی معیارِ تنقید نے دراصل جسمانی شہوت رانی کے ساتھ ذہنی عیاشیوں کے فروغ کے لیے ادب کا ایک انتہائی گھناؤنا اور مکروہ تصور پیش کیا ہے جس میں صنفِ نسواں لفظوں کے پیکر میں "بے لباس عریانی" سے زیادہ برہنہ نظر آتی ہے۔ وہ یورپ جو سگریٹ کے ہر کش کے ساتھ عورت کے لمس کا بھوکا ہے وہ پاکیزہ ادب اور اسلامی نقطۂ نظر کی اہمیت کیوں کر محسوس کر سکتا ہے۔ البتہ ہمیں شکوہ ہے ان روشن خیالوں سے جو روشنی کے چکر میں تاریکیوں کے عمیق غاروں میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھے   روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں

(مقبول احمد سالک مصباحی، بانی ومہتمم جامعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، نئی دہلی)

ہمارے بیش تر ادبا ادبی نرگسیت کا شکار ہیں

تعریفِ ادب کے سلسلے میں ناقدین اور علمائے ادب میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں اس لیے مختصر میں ادب کی جامع تعریف کرنا کافی دشوار کن ہے۔ اور یوں بھی کوئی تعریف ادب کی وسعت اور نیرنگی کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ بعض مغربی ومشرقی ناقدین اسے صرف مسرت و انبساط اور حظ پہنچانے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم ناقدین نے بھی صرف جمالیاتی انبساط پر ہی زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال سے ادب کو ان دائروں تک محدود کر دینا درست نہیں۔

ڈاکٹر شارب ردولوی کے مطابق ادب پر سب سے پہلا باقاعدہ اظہارِ خیال افلاطون نے کیا ہے۔ اس کی مشہور زمانہ کتاب "ریاست" (State) نے دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ اپنی اس کتاب کے ذریعہ اس نے تمام مروجہ روایات سے بغاوت کا علم بلند کرنے کے ساتھ ساتھ حسن اور حقیقت کی تلاش میں ایک نئے فکری نظام کی بنیاد ڈالی۔ اس نے فنونِ لطیفہ کو اپنی اس کتاب میں کوئی جگہ نہیں دی اور اسے صرف "نقل کی نقل" (Limitation of an Limitation) قرار دیا۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ فنونِ لطیفہ کا قائل نظر آتا ہے، جیسا کہ اس کے بعض مقالوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ اور معروف نقاد اٹکنس نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"افلاطون نے بسترِ مرگ پر ہومر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا۔" (English Litterary Criticism, Atkins, p106)

لہٰذا ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ "ریاست" کی تخلیق کے بعد اس کے افکار وخیالات میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔

ابن خلدون نے اپنی کتاب کے مقدمے میں ادب کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق:

"ادب نام ہے اشعار واخبارِ عرب کے یاد کر لینے کا اور ساتھ ہی ساتھ ہر علم سے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں، یعنی علومِ لسانیہ سے بھی اور علومِ شرعیہ سے بھی۔ متقدمین نے نزدیک ادب کی پوری تعریف یہی ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون، مترجم: سعد حسن خاں یوسفی، ص: ۵۷۴)

ڈاکٹر شارب ردولوی کے مطابق: "ادب کی تعریف میں پہلی بار علومِ لسانیہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ابن خلدون کے یہاں ہی ملتا ہے۔" (جدید اردو تنقید، از: ڈاکٹر شارب ردولوی، ص: ۲۹)

علما نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے اسے تفسیر حیات کا نام دیا ہے اور تفسیر بغیر تنقیدی شعور کے ممکن نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ تخلیق ادب کے ساتھ ہی تنقید کا شعوری عمل شروع ہو جاتا ہے۔

عام طور سے یونانی ادب کو دنیا کا قدیم ترین ادب مانا جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ادبی تنقید کا پہلا تاریخی اشارہ بھی یونانی ادب ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہومر جو مشہور یونانی شاعر ہے، اس کی اوڈیسی کی آٹھویں جلد میں تنقیدی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پھر افلاطون کے یہاں بھی تنقید کا رجحان پایا جاتا ہے، البتہ اس کی تنقید فلسفیانہ رنگ وآہنگ کی حامل نظر آتی ہے۔ پروفیسر بوچر کے مطابق:

"اس نے (افلاطون) وسیع اور فلسفیانہ تنقید کا سنگِ بنیاد رکھا جو علم وادب کی روح کو انسان کی جلوہ گاہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ادب کی اندرونی کیفیتوں اور نامعلوم گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔" (روحِ تنقید، از: محی الدین زور، ص: ۱۶۰)

یونانی ادب کی طرح ہی عربی ادب کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ قدیم عربی ادب میں بہترین شاعری کے نمونے ملتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لیے انھوں نے اصول اور قاعدے بھی بنائے ہوں گے۔ قدیم عربی ادب میں اصولِ نقد کا تذکرہ ابن رشیق کی "کتاب العمدة" میں کافی تفصیل سے ہے۔ ابنِ خلدون نے بھی اپنے مقدمہ میں اصولِ نقد پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اردو ادب میں باقاعدہ تنقیدی شعور کا داخلہ حالی کے "مقدمہ" سے ہوا۔ بعد ازاں بنیاد کے مطابق ہی عمارت کی تعمیر ہوئی، یعنی اردو کی ادبی تنقید مکمل طور پر مغربی اصولِ نقد کی اقتدا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کی تشکیل میں جن تنقیدی رویوں کا دخل اب تک رہا ہے ان کی اجمالی فہرست حسبِ ذیل ہے:

(۱)- ترقی پسند تنقید (۲)- کلاسیکی تنقید (۳)- نوکلاسیکی تنقید (۴)- رومانی تنقید (۵)- نفسیاتی تنقید

(۶) - جمالیاتی تنقید (۷) - تاثراتی تنقید (۸) - تاریخی تنقید (۹) - مارکسی تنقید (۱۰) - سائنٹفک تنقید
(۱۱) - تعریفی تنقید (۱۲) - توضیحی تنقید (۱۳) - تقابلی تنقید (۱۴) - تجزیاتی تنقید (۱۵) - نو تنقید

ان تمام تنقیدی رویوں پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں، البتہ ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ ادبی تنقید کا کوئی ایک ہمہ گیر اصول پیش کرنا یا وضع کرنا جو ہر دور کے ادب یا ہر صنفِ شعر و ادب پر یکساں طور پر منطبق کیا جاسکے، ناممکن ہے۔

اب ہم زیرِ بحث موضوع "ادبی تنقید کا اسلامی نقطۂ نظر" کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ادبی تنقید پر اس پہلو سے بحث شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ لیکن ہمارے خیال سے ادب کو اسلامی نقطہ نگاہ سے پرکھنا اور جانچنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلام ہی وہ لافانی اصول و قوانین عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی رہ نمائی کرنے کے ساتھ اس کے اقوال و افعال کی حدیں بھی متعین کرتا ہے۔ فی زمانہ اظہارِ بیان اور قلم کی آزادی کے نام پر مشرق و مغرب میں کیا کچھ ہو رہا ہے، یہ ہم سے اور آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہم مانتے ہیں قلم آزاد ہے، لیکن اس آزادی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں سر راہ لاٹھی گھمانے کی آزادی مل گئی۔ ہندوستان آزاد ہے، اس لیے ہم بھی آزاد ہیں۔ لیکن ہماری یہ آزادی وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد پاس پورٹ اور ویزے کی پابندیاں شروع ہوتی ہیں۔ اب اگر کوئی ان پابندیوں کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ درانداز، قانون کا مجرم اور دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ مختصر میں یہ کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ہماری آزادی وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے۔

ادبی تنقید کے اسلامی نظریے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ آج ہمارے بیش تر قلم کار "ادبی نرگسیت" کا شکار ہیں۔

یہاں "نرگسیت" اور "ادبی نرگسیت" کی وضاحت ضروری ہے: قدیم یونانی دیومالا میں نارسس نام کے ایک خوب صورت ہیرو کا تذکرہ ملتا ہے جو اپنی تعریف سنتے سنتے اتنا خود پسند ہو گیا کہ ہر وقت اپنے آپ میں مست رہنے لگا۔ ایک روز پانی میں اپنا عکس دیکھا تو خود پر عاشق ہو گیا۔ وہ رات دن اپنا عکس پانی میں دیکھتا رہتا۔ پیاس سے نڈھال ہونے کے باوجود بھی پانی کو ہاتھ نہ لگاتا کہ پانی کی سطح میں ارتعاش سے کہیں اس کا عکس بکھر نہ جائے۔ چناں چہ وہ اپنے عکس میں گم بھوکا پیاسا ایک روز جان سے گزر گیا اور دیوتاؤں نے اسے نرگس کے پھول میں تبدیل کر دیا جو آج تک پانی میں اپنا عکس دیکھتا رہتا ہے۔ (بی. بی. سی. اردو، جمعہ ۳۰/ جنوری ۲۰۰۹ء صبح ۱۰:۵۰ کے نشریہ سے ماخوذ)

یہ تو تھی دیومالائی کہانی۔ علمِ نفسیات میں نرگسیت کی اصطلاح بیماری کی حد تک بڑھی ہوئی خود پسندی کے لیے استعمال ہوتی ہے یعنی جب گرد و پیش سے آنکھیں چرا کر کوئی شخص اپنے آپ کو دنیا کی اہم ترین شخصیت سمجھنا شروع کر دے اور اپنی ذات کے نشے میں بدمست رہنا شروع کر دے۔ ہمارا خیال ہے "نرگسیت" کی وضاحت کے ساتھ ہی "ادبی نرگسیت" کا مفہوم بھی ہمارے قارئین پر واضح ہو چکا ہوگا۔

تو جیسا کہ ہم نے لکھا: آج ہمارے بیش تر قلم کار "ادبی نرگسیت" کا شکار ہیں۔ وہ خود کو "سب سے بڑا ادیب، شاعر یا نقاد" سمجھتے ہیں اور قلم کی آزادی کے زعم میں اخلاقیات کی ساری حدیں پھلانگتے چلے جاتے ہیں، ان کے ذہن میں ایک بار بھی یہ تصور پیدا نہیں ہوتا کہ جس طرح ہم آزاد ہیں اسی طرح ہمارا مد مقابل بھی آزاد ہے۔ اس کی آزادی کا احترام کرنے کے بعد ہی ہم اپنی آزادی کا حقیقی لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں کچھ رسالے بھی آتے ہیں جو بلاوجہ کی نام نہاد ادبی اور علمی مباحثہ کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور ادبی معرکہ آرائی کے پس پردہ ذاتی اور مادی مفاد کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہاں کسی مخصوص رسالے کا نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جو رسائل یا جو قلم کار اس روش پر گام زن ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔

اب ہم ذیل میں صحت مند ادبی تنقید کے چند رہ نما اصول نقل کرتے ہیں۔ یہ اصول ہمارے وضع کردہ نہیں ہیں بلکہ مختلف ادبی تنقیدی روایتوں سے ماخوذ ہیں، لیکن ان کی قدروں کی بنا پر انھیں بلاشبہہ تنقید کا اسلامی نظریہ کہا جاسکتا ہے:

[۱] ادب برائے ادب نہ ہو کر ادب برائے زندگی ہو، یعنی ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے اور اپنے وقت کی سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی قدروں کا ہم نوا ہونا چاہیے۔ اور ادب کے اس رخ پر تنقید کا رویہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

(جدید اردو تنقید، از ڈاکٹر شارب ردولوی، ص: ۳۶)

[۲] ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا زندگی سے کتنا تعلق ہے، وہ کہاں تک زندگی کے صحیح مفہوم کو پیش کرتا ہے اور ہماری رہ نمائی کرتا ہے، کس حد تک وہ حال کی ترجمانی کرتا ہے، ماضی پر روشنی ڈالتا ہے اور مستقبل کے لیے صحیح اور معتبر روش کا تعین کرتا ہے۔ (ایضاً، ص: ۳۷)

[۳] اگر نقاد کسی بات کو بلاوجہ، جیسا چاہتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں اور پھر اپنے ہی نکالے ہوئے نتیجوں کو صحیح سمجھ کر ان کی بنا پر بحث کرتے ہیں، جب ایک بار وہ اپنی رائے ظاہر کر دیتے ہیں تو پھر جو کچھ ان کی رائے کے خلاف یا اس سے مختلف ہو اس کو غلط قرار دے کر اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ تو یہ تنقیدی رویہ درست نہیں۔ (بوطیقا۔ از: ارسطو، مترجم: عزیز احمد، ص: ۹۴)

[۴] ایک ادبی تخلیق صرف لکھنے والے ہی سے نہیں بلکہ پڑھنے والے سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ نقاد ایک قاری کی حیثیت رکھتا ہے جو بغیر کچھ نظر انداز کیے ہوئے اس کی گہرائیوں میں پوشیدہ معانی کو سمجھتا ہے، وہ اس کو پسند کرے یا نہ کرے، وہ خواہ سچ ہو یا جھوٹ، شیریں ہو یا تلخ، اسے اس کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اس کے بعد اسے اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

(Making of Literature , Scott James, p375)

[۵] ادب کی تنقید خالص ادب کے دائرے میں رہ کر نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے دوسرے علوم کا سہارا لینا ضروری ہے۔

[۶] نقاد کو ہر اس چیز کا بہترین سراغ رساں ہونا چاہیے جو کہ اس سے چھپائی جا رہی ہے اور مصنف کے پوشیدہ رجحانات معلوم کرنا چاہیے۔ اس کی گہرائی میں چھپی ہوئی اور ناپی نہ جاسکنے والی چیزوں کو ظاہر کرنا چاہیے اور مصنف کو اس حد تک سمجھنا چاہیے جتنا کہ وہ خود اپنے کو نہیں سمجھتا۔

[۷] نقاد کا فرض ہے کہ وہ انسانوں کو ان کی اصل حالت میں دیکھے۔ ان کی زندگی کے مختلف رخوں کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ کرے اور پھر بلا کم و کاست اپنی رائے ایک غیر جانب دار محقق اور نقاد کی حیثیت سے قائم کرے۔

(فرانسیسی ادب، از: ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ص: ۳۹۲)

[۸] تنقید محض رائے دینا یا میکانکی طور پر زبان اور فن سے متعلق خارجی امور کی فہرست مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ تخلیق کار کے وجدانی شعور کے بھید کھولنا ہے۔

[۹] ادبی تنقید اصل میں ادب کی تنقید ہے، لیکن چوں کہ ادب بذاتِ خود زندگی کی تنقید ہے، اس لیے ادبی تنقید لامحالہ زندگی کی تنقید بن جاتی ہے لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ تنقید کرتے وقت ہم اپنا سارا وقت خیالات ہی کے تجزیہ میں صرف کر دیں اور حقائق سے آنکھیں بند کر لیں۔ (تنقیدی شعور، از: ممتاز حسین، ص: ۱۷۲)

[۱۰] تنقید میں توازن ضروری ہے جو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ نقطۂ نظر اور نقطۂ حیات کی نوعیت انسانی ہونی چاہیے۔ تنقید میں جب تک انسانی زاویۂ نظر نہ ہو اس وقت تک وہ فنی تخلیقات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی۔

(تنقیدی تجربے، از: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص: ۳۹)

[۱۱] نقاد کا ادبی فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ صرف خوبی یا صرف خامی کا بیان کسی نقاد کے ذہنی دیوالیہ پن کا اظہار تو ہو سکتا ہے اصل تنقیدی شعور کا نہیں۔

[۱۲] نقدِ ادب کے پس پردہ ذاتیات کو مشقِ ستم بنانا سطحیت کی علامت ہے۔ ایک نقاد کا ادبی فریضہ تو یہ ہے کہ وہ شخصیت سے بالاتر ہو کر فن پارے پر بحث کرے۔

ہمارے خیال سے ادبی تنقید کے یہ رہ نما اصول کسی فن پارے کی صحیح قدر و قیمت کے تعین میں کلیدی کردار ادا کریں گے اور اسی کے ساتھ ہی ایک نئے ادبی شعور کی تعمیر ممکن ہو سکے گی۔

(مہتاب پیامی، شعبۂ کمپیوٹر جامعہ اشرفیہ، مبارک پور payamee@gmail.com)

گوشۂ ادب

اشعارِ رضا کی توضیح

ڈاکٹر شکیل اعظمی

محترم جناب ڈاکٹر شکیل اعظمی جامعہ اشرفیہ کے نام ور فاضل اور جامعہ اشرفیہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں۔ باصلاحیت، بلند فکر اور وسیع المطالعہ ہیں، شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، بلند پایہ شاعر اور متوازن الفکر نقاد ہیں۔ شعر و سخن کے پیچیدہ مسائل میں اہلِ علم ان کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ عرصہ ہوا بریلی شریف سے امام احمد رضا کے چند اشعار کی توضیح و تشریح اور چند الفاظ کی تحقیق کے حوالے سے انہیں ایک مراسلہ موصول ہوا تھا۔ علالت اور گوناگوں مصروفیت کی وجہ سے بر وقت جواب نہ لکھ سکے، لیکن کچھ دنوں بعد مراسلہ کا جواب سپردِ قلم کر لیا تھا۔ جوابات انتہائی اہم ہیں، افادۂ عام کے لیے اشرفیہ کے صفحات ان کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین ہیں۔ از: **مبارک حسین مصباحی**

*** سوال ***

زیرِ میزاب ملے خوب کرم کے چھینٹے
ابرِ رحمت کا یہاں زور برسنا دیکھو!

مناسب سمجھیں تو اہلِ زبان و ادب کے اشعار سے استدلال فرمادیں کہ "زور برسنا" کیسا ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

پہلے مستند اساتذہ کے کلام میں اس نوع کے استعمال ملاحظہ فرمائیں، پھر بعد میں خاص طور پر "زور برسنا" کا استعمال کلام اساتذہ میں ملاحظہ فرمائیں—

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں
دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا (میرؔ)

مصرعِ ثانی میں "دیکھ رہتا ہوں" دیکھتا رہتا ہوں کی جگہ اور "دیر منہ سب کا" دیر تک کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم
کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا (میرؔ)

مصرعِ اولیٰ میں "اٹھ کعبے گئے ہم" اٹھ کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا (میرؔ)

مصرعِ اولیٰ میں "رو رو" رو رو کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

کون آیا ہے برے وقت کسی پاس اے داغؔ
لوگ دیوانہ بناتے ہیں کہ وہ آتے ہیں (داغؔ دہلوی)

"کسی پاس" کسی کے پاس کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے
پاؤں توبہ کے لڑکھڑانے لگے

"جھوم جھوم" جھوم جھوم کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

ہم تو ویران ہو اس طرح وطن سے نکلے
روح جس طرح کسی شخص کے تن سے نکلے (ذوقؔ دہلوی)

"ویران ہو" ویران ہو کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

اس نے مارا رخِ روشن کی دِکھا تاب مجھے
چاہیے جائے کفن چادرِ مہتاب مجھے (ذوقؔ)

"دکھا تاب" دکھا کر تاب کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

کوئی بھی تدبیر جب دیکھی نہیں چلتی ہے تب
میں رقیبِ روسیہ سے ذوقؔ مل رہنے لگا (ذوقؔ)

مصرعِ ثانی میں "مل رہنے لگا" مل کر رہنے لگا کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سن سن اپنے
کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے (ذوقؔ)

"سن سن اپنے" سن سن کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

نرگس نے جو نہ دیکھا پھر آنکھ اٹھا چمن میں
کیا جانے کس نے کس نے کیا کر لیا چمن میں (آتشؔ)

"آنکھ اٹھا" آنکھ اٹھا کر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

اب آیئے خاص طور پر لفظ "زور" کے استعمالات ملاحظہ فرمایئے۔ "زور" مختلف معانی میں مستعمل ہے۔

◀ کثرت، زیادتی اور از حد کے مفہوم میں۔

یہ زور آتشِ رنگِ حنا نے گرمی کی
تری ہتھیلی کا تل صورتِ سپند ہوا (وزیرؔ)

رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

عالمِ مستی میں جرأتؔ پڑھ غزل اک اور بھی
زور کیفیت اٹھاتے ہیں ترے اشعار سے (جرأتؔ)

◀ زور (برائے تعجب) قیامت، غضب، بے ڈھب۔

غیر کو نام ہے سرنامہ ترے نام کا ہے
مہرباں زور یہ تم نے ستم ایجاد کیا (ناسخؔ)

◀ بمعنی عجیب و غریب، انوکھا۔

خاک سر پر ہے، مہر و مہ پامال
اے فلک زور انقلاب ہوا (ناسخؔ)

◀ بطورِ صفت بمعنی خوب، اچھا۔

یار کا آستاں بتایا ہے
زور دل نے مکان پایا ہے (جرأتؔ)

زور کیفیت اس شراب میں تھی
لب پہ رکھتے ہی بس ہوئے بے ہوش (مجنوںؔ)

فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے مذکورہ شعر میں "زور برسنا" زور زور سے برسنا، موسلا دھار برسنا، از حد برسنا کا استعمال از روئے زبان و قواعد بالکل درست ہے۔ کچھ حضرات نے "زور برسنا" کو کتابت کی غلطی پر محمول کرتے ہوئے "روز برسنا" صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن "زیرِ میزاب کرم کے چھینٹے" کے بالمقابل ابرِ رحمت کا "زور برسنا" یعنی "زور زور سے برسنا" ہی زیادہ موزوں، بلیغ، معنیٰ خیز اور قرینِ قیاس ہے۔

*** سوال ***

غبار بن کر نثار جائیں، کہاں اب اس رہ گزر کو پائیں
ہمارے دل، حوریوں کی آنکھیں، فرشتوں کے پر جہاں بچھے ہیں

کیا "حوریوں" کا استعمال معنیٰ جمع (حوروں) کے لیے کہیں اور بھی ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

"حوریوں" کا استعمال بجائے "حوروں" بالکل درست ہے۔ کلام اساتذہ سے اسناد کے قبل اس کی لغوی تحقیق "غیاث اللغات" کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

"حوراں بواؤ معروف مزید علیہ حوراں چہ گاہی در آخر لفظ حور یائے زائدہ آرند چناں کہ درہمیان وہمیانے۔" (از جواہر المعروف)

*** کلامِ اساتذہ سے استناد ***

وہ تو حوریانِ بہشت ہیں کہ ہر اک فقیر سے شاد ہوں
یہ بتانِ ہند ہیں زاہدو! یہ حریص ہوتے ہیں زر سے خوش (داغؔ)

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب (اقبالؔ)

حوریاں فارسی جمع ہے۔ حوریوں ہندی جمع ہے۔

*** سوال ***

ابنِ زہرا سے ترے دل میں ہیں یہ زہر بھرے
بل بے او منکرِ بے باک یہ زہرا تیرا

"بل بے" (کلمۂ تحسین) کیا اس کا استعمال اہلِ ادب کے یہاں ملتا ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

لفظ "بل بے" کا استعمال کلامِ اساتذہ میں بکثرت ملتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بل بے اے آتشِ غم سینے میں مثلِ منقل
کثرتِ داغ سے انبار ہے انگاروں کا (ذوقؔ)

بل بے چتون تری معاذ اللہ
اف رے ٹیڑھی نگاہ کیا کہنا (بیخودؔ دہلوی)

مہروش بل بے ترے حسن جہاں تاب کی تاب
رخ سے گرم آئینہ ہو، آئینہ سے زانو گرم (ذوقؔ)

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گیا
اف رے بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے (ذوقؔ)

کھلے ہی جاتے ہیں سب غنچے زہے جوشِ نشاط
لوٹے ہی جاتے ہیں بل بے ہنسی کی شدت (ذوقؔ)

بل بے وحشت اب تلک بھی شاخِ آہو کی طرح
پیچ کھاتا ہے دھواں میرے چراغِ گور کا (ذوقؔ)

بل بے تری گرمی کہ اب اے سوزِ محبت
ہم نام کو آنکھوں میں نمی کو نہیں پاتے (ذوقؔ)

*** سوال ***

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذی شان گیا
ساتھ ہی منشیِ رحمت کا قلم دان گیا

مصرعِ ثانی توضیح طلب ہے۔

*** توضیح و تشریح ***

اس شعر میں امامِ عشق و محبت نے "اللّٰہ المعطی و أنا قاسم" کی شاعرانہ تفسیر بیان کی ہے اور خزانۂ قدرت میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے

اختیارات و تصرفات کا بیان فرمایا ہے۔ مصرعِ اولیٰ تو بہت ہی واضح ہے۔ مصرعِ ثانی میں **"منشیِ رحمت"** کے دو احتمالات ہیں—

منشیِ رحمت سے مراد یا تو خالقِ رحمت یعنی رب العالمین جل جلالہٗ ہے یا منشیِ رحمت سے مراد فرشتۂ رحمت ہے۔

احتمالِ اول میں یعنی منشیِ رحمت سے ذاتِ باریِ تعالیٰ مراد لینا کئی وجہوں سے مرجوح ہے۔ آیئے پہلے فرہنگِ آصفیہ میں منشی کے درج کردہ معانی ملاحظہ فرمایئے:

(۱) منشی (عربی) آغاز کرنے والا، پیدا کرنے والا، اپنے دل سے بات نکالنے والا۔ (۲) محرر، نویسندہ، کاتب، متصدی، قبالہ نویس۔ (۳) انشا پرداز، مضمون نگار، خوش تحریر، خوش قلم، اہلِ فارس مرزا کہتے ہیں۔ (۴) اہلِ قلم کا اعزازی خطاب

مصرعِ ثانی میں اگر مذکورہ بالا معانی میں سے پہلا معنیٰ پیدا کرنے والا مراد لیا جائے تو بلاشبہہ ذاتِ باریِ تعالیٰ پر اس کا اطلاق درست ہوگا اور مطلب ہوگا "خالقِ رحمت" مگر یہ معنیٰ عربی لفظ ہونے کی حیثیت سے ہے اور یہاں ترکیب فارسی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے عربی معنیٰ کے علاوہ بقیہ معانی میں سے کوئی معنیٰ ہونا چاہیے۔ مثلاً محرر، کاتب، قبالہ نویس، انشا پرداز، مضمون نگار وغیرہ۔ مگر ان میں سے کوئی بھی معنیٰ ذاتِ باریِ تعالیٰ کے اسمِ صفت ہونے کے لائق نہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان میں لفظ منشی بولنے سے ذہن انھیں معانی کی طرف تبادر کرے گا اور ہم مراد لیں گے خالقِ رحمت تو بلاشبہہ اس میں ایہام کی صورت پیدا ہوگی جو عیب ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں لفظ "منشی" باریِ تعالیٰ عزوجل کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم قرار پائے گا اور اللہ تعالیٰ عزوجل کے اسما بیانِ شرع پر موقوف ہیں۔

علامہ تفتازانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "اسماء اللّٰہ تعالیٰ توفیقیة" اور لفظ "منشی" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے نہیں۔ اور یہ امر بھی مسلم اور متفق علیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی ایسے اسم یا صفت کا اطلاق جائز نہیں جس سے عیب و نقص کا وہم پیدا ہو۔

امام ابو القاسم قشیری نے فرمایا ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع سے جن اسما کا ثبوت ہو ان اسما کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے اور جس اسم کا ان میں ثبوت نہ ہو اس کا اطلاق جائز نہیں خواہ اس کا معنیٰ صحیح ہو۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ لفظ جس کے اطلاق کا شریعت میں ثبوت ہو عام ازیں وہ مشتق ہو یا غیر مشتق وہ اللہ تعالیٰ کے اسما میں سے ہے۔ اور ہر وہ لفظ جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہے عام ازیں کہ اس میں تاویل ہو یا نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور اس پر اسم کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ امام رازی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلالت کرتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں:

★★★ پہلی قسم کی تفصیل یہ ہے ★★★

1. جن صفات کا اللہ تعالیٰ کے لیے ثبوتِ قطعی ہے، ان کا اطلاق مفرد اور مضاف دونوں اعتبار سے صحیح ہے جیسے قادر، قاہر، یا فلاں پر قادر، فلاں پر قاہر۔
2. جن صفات کا بطور مفرد اطلاق صحیح ہے اور بطور مضاف خاص شرائط کے ساتھ صحیح ہے مثلاً: خالق یا ہر چیز کا خالق کہنا صحیح ہے، لیکن بندر اور خنزیر کا خالق کہنا صحیح نہیں۔
3. جن صفات کا بطور مضاف اطلاق صحیح ہے اور بطور مفرد صحیح نہیں، مثلاً منشی کہنا صحیح نہیں اور "منشی الخلق" کہنا صحیح ہے۔

★★★ دوسری قسم ★★★

دوسری قسم وہ ہے کہ اگر شریعت میں اس کا سماع ثابت ہو تو اس کا اطلاق کیا جائے ورنہ نہیں۔

★★★ تیسری قسم ★★★

تیسری قسم وہ ہے کہ شریعت میں اس کا بحیثیت افعال سماع ہے تو انھیں کا اطلاق کیا جائے گا اور ان پر قیاس کر کے ان کے مشتقات کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جیسے "مکر اللّٰہ۔ ویستھزی بھم" سو اللہ پر ماکر اور مستھزی کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ (ماخوذ از شرح صحیح مسلم کتاب الذکر والدعا الخ، جلد: سابع، ص: ۴۵۱-۴۵۲، تصنیف علامہ غلام رسول سعیدی)

چوں کہ امام رازی علیہ الرحمہ نے منشی الخلق کے اطلاق کا جواز فرمایا ہے، اس پر قیاس کرتے ہوئے منشی رحمت کا اطلاق ذاتِ باریِ تعالیٰ پر بظاہر درست معلوم ہوتا ہے، لیکن یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ "منشی الخلق" عربی ترکیب ہے اور اسی معنیٰ میں دائر ہے اور تبادرِ ذہنی بھی ذاتِ باریِ تعالیٰ کی جانب ہوگا، اس میں ایہام کا پہلو نہیں— اور "منشیِ رحمت" فارسی ترکیب ہے اور اردو و فارسی میں "منشی" خالق کے معنیٰ کے علاوہ دیگر معانی کا بھی محتمل ہے بلکہ عام طور پر دیگر معانی ہی کی طرف تبادرِ ذہنی ہوتا ہے۔ مثلاً محرر، متصدی،

قبالہ نویس، مضمون نگار وغیرہ تو اس میں واضح طور پر ایہام کی صورت موجود ہے جو معیوب ہے۔ اس لیے منشیِ رحمت سے خالقِ رحمت مُراد لینا درست نہیں۔

اب آیئے! منشیِ رحمت سے خالقِ رحمت مراد نہ لے کر دوسرے معانی مراد لینے کی ترجیحات ملاحظہ فرمایئے:

بہارِ شریعت، حصہ اول، ص: ۲۳/ (بیانِ ملائکہ) کے تحت درج ہے کہ "ان کو مختلف خدمتیں سپرد ہیں، بعض کے ذمہ حضراتِ انبیائے کرام کی خدمت میں وحی لانا، کسی کے متعلق پانی برسانا، کسی کے متعلق ہوا چلانا، کسی کے متعلق روزی پہنچانا، کسی کے ذمہ ماں کے پیٹ میں بچہ کی صورت بنانا، کسی کے متعلق بدنِ انسان کے اندر تصرف کرنا، کسی کے متعلق انسان کی دشمنوں سے حفاظت کرنا، کسی کے متعلق ذاکرین کے مجمع کو تلاش کر کے اس میں حاضر ہونا، کسی کے متعلق نامۂ اعمال لکھنا، بہتوں کا دربارِ رسالت میں حاضر ہونا، کسی کے متعلق سرکار میں مسلمانوں کی صلاۃ و سلام پہنچانا، بعضوں کے متعلق مردوں سے سوال کرنا، کسی کے ذمہ روح قبض کرنا، بعضوں کے ذمہ عذاب کرنا، کسی کے متعلق صور پھونکنا اور ان کے علاوہ بہت سے کام ہیں جو ملائکہ انجام دیتے ہیں۔"

ان عبارتوں سے ثابت ہوا کہ فرشتے کارخانۂ قدرت میں تصرف کرنے پر مامور ہیں اور ان کے بے شمار شعبے ہیں۔

تفسیر روح المعانی پارۂ عم، ص: ۲۶/ میں ہے کہ:

"ان یکون المراد بالسابحات و ما بعدھا طوائف من الملائکة یسبحون في قبضھم، فیسبقون إلیٰ ما أمر به من الأمورِ الدنیویة والأخرویة فیدبرون أمره من کیفیة وما لا بد منه فیه ویعم ذالک ملائکة الرحم وملائکة العذاب۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کچھ فرشتے رحمت کی تدبیر و تقسیم پر مامور ہیں۔

"فتدفع نسخة الارزاق إلیٰ میکائیل علیه السلام." (تفسیر روح المعانی، ج:۹، ص: ۱۱۳)

"وفصل کل امر من قسمة الارزاق وغیرھا من باب الرحمة." (ایضاً، ص: ۱۱۴)

غیاث اللغات میں میکال و میکائیل کا معنیٰ درج ہے: "نام فرشتہ کہ بر رزق رسانی مخلوقات مامور است۔"

ایک دوسری توجیہ یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ نعمت و رحمت کو رزق سے عام مان کر حضرت میکائیل علیہ السلام کی تخصیص نہ کی جائے، کیوں کہ ہوا چلانا، پانی برسانا، دشمنوں سے حفاظت کرنا وغیرہ بھی از قبیلہ نعمت و رحمت ہی ہے تو منشیِ رحمت سے یہاں مطلقاً فرشتۂ رحمت مراد لیا جائے۔

فرہنگِ آصفیہ، جلد: دوم، ص: ۱۴۸۴/ پر مذکور ہے "قلم دان دینا یا عنایت کرنا فعلِ متعدی صدارت یا متعدی گری، خواہ وزارت کا عہدہ بخشنا، پرائیویٹ سکریٹری بنانا، منشیِ خاص مقرر کرنا۔" ان تشریحات و معانی کی روشنی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت میکائیل علیہ السلام کو رحمت کی تقسیم کا منشیِ خاص بنایا گیا ہے اور خزانۂ رحمت کا شعبہ انھیں کے سپرد کیا گیا ہے، جس کی تائید ہمارے آج کل کے روزمرہ کے استعمال سے ہوتی ہے کہ فلاں کو وزارتِ خارجہ کا قلم دان دیا گیا، فلاں کو وزارتِ داخلہ کا قلم دان دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ جس سے مراد محکمہ و شعبہ ہے۔

پس ان تمام تشریحات و تنقیحات کے بعد مذکورہ شعر میں "منشیِ رحمت" سے مراد "فرشتۂ رحمت" لیا جائے اور فرشتۂ رحمت سے یہاں حضرت میکائیل علیہ السلام کی ذات مُراد لی جائے، کیوں کہ حضرت میکائیل علیہ السلام ہی خزانۂ رحمت کے وزیر ہیں اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا گیا ہے، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کے متعلق حکم فرمائیں وہ انھیں تقسیم کر دیں۔

اور کسی کے حکم و اذن سے نعمتیں تقسیم کرنے کو اگرچہ وہ نعمتیں اس کے اہلِ کار، خدام اور کارندے تقسیم کرتے ہیں، اذن و حکم دینے والے کی طرف منسوب کرنا حد درجہ شائع و ذائع ہے۔

جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے غریبوں میں کپڑا اور غلہ تقسیم کیا یا فلاں وزیر نے مستحقین کو انعامات تقسیم کیے، یا فلاں ادارے کے منیجر نے بچوں کو وظیفہ تقسیم کیا، وغیرہ وغیرہ۔ حالاں کہ بادشاہ، وزیر، منیجر کے اہلِ کار، خدام اور کارندے ان اشیا کو تقسیم کرتے ہیں۔

اسی طرح **"نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذی شان گیا"** میں تقسیم نعمت کا انتساب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیا گیا ہے، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ ہی کے حکم و اذن سے نعمتیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ **(جاری)**

نقد ونظر

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے

نام کتاب : عرفان امین
(تعارف جناب حضور سید شاہ محمد امین احمد ثبات فردوسی)
مرتب : واحد نظیر
صفحات : (۱۶۰) قیمت : ۱۰۰
ناشر : الجامعۃ الرضویہ، مغل پورہ
پٹنہ سٹی (بہار) ۸۰۰۰۰۸
مبصر : محمد عبد المبین نعمانی

الجامعۃ الرضویہ مغل پورہ، پٹنہ سٹی (بہار) پٹنہ میں اہل سنت و جماعت کا وہ واحد ادارہ ہے جو مسلکِ اعلیٰ حضرت کا ترجمان ہے، جسے جناب الحاج سید ولی الدین رضوی نے اپنے پیر ومرشد حضور تاج الشریعہ مولانا مفتی اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم القدسیہ کی یادگار کے طور پر قائم کیا ہے۔ ادھر چند سالوں سے بانی الجامعۃ الرضویہ عرسِ امام احمد رضا کے موقع پر کسی نہ کسی عظیم شخصیت پر خصوصی مجموعۂ مقالات شائع کر کے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ سال "رضاشناسی" کے عنوان سے جو مجموعہ شائع ہوا وہ مجددِ اعظم امام احمد رضا کی شان میں اہلِ علم و ادب کے نئے اور اہم مقالات پر مشتمل تھا اور امسال ممدوحِ اعلیٰ حضرت، فخر خاندان ثبات فردوسی معروف بہ "جنابِ حضور" کی شان مین مقالات و مضامین مجموعۂ "عرفان امین" کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس مین سولہ (۱۶) مقالات شامل ہیں۔ شروع میں "مرتب نامہ" اور "میرے عزائم" کے عنوان سے ادارتی مضامین ہیں جو امسال عرسِ رضا منعقدہ ۲۸/ صفر ۱۴۳۰ھ / ۲۴/ فروری ۲۰۰۹ء کے حسین موقع پر جاری ہوا۔ جلسے اور سیمینار کی صدارت رفیق ملت سید نجیب حیدر نائب سجادہ نشیں خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے فرمائی۔ سیمینار دن میں قبل ظہر ہوا اور بعد نمازِ عشا عام اجلاس ہوا جس میں الجامعۃ الرضویہ سے فارغ ہونے والے حافظ طلبہ کی دستار بندی بھی ہوئی۔

مجلہ "عرفانِ امین" چشم وچراغ خاندان مخدوم بہاری کے احوال و کرامات اور ان کے تصلب فی الدین کا آئینہ ہے۔ یہی وہ جناب حضور امین احمد ثبات فردوسی ہیں جن کی صدارت میں ہونے والے پٹنہ اجلاس میں سرکارِ اعلیٰ حضرت کو مجدد کا خطاب دیا گیا۔ ایسی عظیم شخصیت کے احوال و کوائف سے روشناس کرانا ہماری بڑی اہم ذمہ داری تھی جسے یہ مجلہ پوری کر رہا ہے۔ اس میں لکھنے والے مفتیانِ کرام اور علمائے عظام بھی ہیں اور اہلِ علم و دانش بھی۔ ضرورت ہے کہ ایسے تاریخی اور یادگار مجلہ کو گھر گھر پہنچایا جائے اور اپنی لائبریری کو سجایا جائے۔ ۱۶۰/ صفحات پر مشتمل مجلہ نہایت خوب صورت اور عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب انداز سے شائع کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کی قیمت سو روپے بہت کم ہے۔ مگر اس کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے اس کی قیمت پچاس روپے رکھی گئی ہے۔ ضرورت مند حضرات جلد از جلد حاصل کر لیں ورنہ شاید مدتوں پھر اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔ آئندہ سال اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے حضرت ملک العلما اور قاضی فضل کریم علیہما الرحمۃ والرضوان کے تذکرے پر مضامین شائع ہوں گے۔ لہٰذا اہلِ علم اپنی معلومات اور مقالات کو بھیجنے کی زحمت کریں۔

☆☆☆

ماہ نامہ پاسبان جدید، بھیونڈی

بیاد گار:
خطیبِ مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی

ایڈیٹر: جمال احمد رضوی

قیمت عام شمارہ: ۱۵/ روپے --- سالانہ: ۱۸۰/ روپے

رابطے کا پتہ

555-Peerani Pada, Shanti Nagar Road
Bhiwandi-421032,
Distt. Thane (Maharashtra)

منظومات

حضوری کا مزہ

دِل کا رشتہ جو مدینے سے مِلا لیتے ہیں
اپنے قدموں میں وہ دنیا کو جھکا لیتے ہیں
دل میں جو گنبدِ خضرا کو بسا لیتے ہیں
دور رہ کر بھی حضوری کا مزہ لیتے ہیں
اُن کی رحمت ہے کہ ہم جیسے گنہ گاروں کو
اپنے دامانِ کرم میں وہ چھپا لیتے ہیں
حاضری کے لیے جس دل میں تڑپ ہوتی ہے
اک نہ اک دن اسے سرکار بُلا لیتے ہیں
یہ بھی اندازِ محبت ہے کہ بہرِ تعظیم
سُن کے ہم نامِ نبی سر کو جھکا لیتے ہیں
زندگی جب بھی نظر آتی ہے بے کیف ہمیں
اپنے ہونٹوں پہ درودوں کو سجا لیتے ہیں
پھول تو پھول ہیں اربابِ محبت تو شکیل
خارِ طیبہ کو بھی آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

اپنے قلم کا فرض ادا کر رہا ہوں میں

دل کو ہجومِ غم سے رہا کر رہا ہوں میں — اشکوں سے ذکرِ صلِ علیٰ کر رہا ہوں میں
کچھ اس میں شک نہیں یہ حدیثِ رسول ہے — دیتا خدا ہے اور عطا کر رہا ہوں میں
ٹل جائیں کیوں بلائیں نہ آئی ہوئی سبھی — یا غوث المدد کی ندا کر رہا ہوں میں
اعلانِ حق کے واسطے باطل کے سامنے — ذکرِ شہیدِ کرب و بلا کر رہا ہوں میں
ذاتِ نبی میں کرتا ہے تو نقص کی تلاش — نامِ نبی پہ جان فدا کر رہا ہوں
کر کے خیالِ بوسۂ نعلینِ مصطفیٰ — فکرِ رسا کو اور رسا کر رہا ہوں میں
بخشش کا اس کو کر دے وسیلہ مرے خدا — تیرے حبیب کی جو ثنا کر رہا ہوں میں
مجرم ہوں، بے عمل ہوں، خطاکار ہوں بہت — ایماں پہ خاتمے کی دعا کر رہا ہوں میں
کر کے بہارِ گلشنِ طیبہ کا تذکرہ — دل کا ہر ایک زخم ہرا کر رہا ہوں میں
خوشبو درودِ پاک کی پھیلی ہے چار سو — محفل میں مصطفیٰ کی ثنا کر رہا ہوں میں
تفریق رنگ و نسل نہ ہو دیں کے نام پر — اے ربِّ کائنات دعا کر رہا ہوں میں
بخشے گا کیف اہلِ محبت کو ہر گھڑی — نعتِ نبی کا تحفہ عطا کر رہا ہوں
عشقِ رسول کا تھا وہ اک پیکرِ حسیں — اس رخ سے ذکرِ وصفِ رضا کر رہا ہوں میں

نعتِ نبی کا حق تو نہ ہوگا ادا شکیل
اپنے قلم کا فرض ادا کر رہا ہوں میں

ڈاکٹر شکیل اعظمی

منقبت در شان حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان

اشرفیہ بانٹتا ہے علم کی دولت کا فیض — فکر فن کا آگہی کا دین کی عظمت کا فیض
اے مبارک پور تو ہے کتنا قسمت کا دھنی — تیری دھرتی کو مِلا ہے حافظِ ملت کا فیض
حضرتِ بے کل کے دل کی بے کلی آخر گئی — حافظِ ملت کی جب ان کو ملا بیعت کا فیض
حضرتِ ارشد کو بخشا وہ عروجِ فکر و فن — آپ کی شفقت، محبت، آپ کی قربت کا فیض
آج مصباحی کا ہر سو دبدبہ ہے رعب ہے — اشرفیہ ہے ترے گلشن کی تربیت کا فیض
آپ کی عظمت کا اڑتا ہے پھریرا ہر طرف — حضرتِ امجد کا ہے یہ فیض کی برکت کا فیض
عالمی شہرت کی حامل ذات میری ہو گئی — اشرفیہ ہے یہ تیری عالمی شہرت کا فیض
جب سے بزمِ اشرفیہ میں ہوا حاضر وصیؔ — مجھ پہ بھی ہونے لگا ہے حافظِ ملت کا فیض

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی

الٰہی مرا نورِ بصیرت عام کردے
سلسلہ ٹوٹے نہیں

یہ ھے میرا وطن

مبارک حسین مصباحی

عرصے سے آرزو تھی کہ ہم اشرفیہ میں کوئی ایسا کالم شروع کریں جس میں اپنے ادراکات، مطالعات، محسوسات اور مشاہدات کی ترجمانی ہو۔ دنیا میں مسائل کل بھی تھے اور آج بھی ہیں مگر عصرِ رواں میں پوری دنیا ہتھیلی کی طرح سامنے نظر آتی ہے اور ایک حساس انسان کو اپنے ارد گرد مسائل کا ہجوم نظر آتا ہے۔ سب پر نہ اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے اور نہ اظہارِ خیال کا کوئی حاصل، مگر بعض مسائل ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا راست تعلق ہمارے مذہب، ہماری ملت اور ہماری سیاسی وسماجی دنیا سے ہوتا ہے۔ ان پر بھی خاموش رہنا ضمیر کی آواز کو کچلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہماری اسی بے حسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کی قومی بساط پر ہمارا جماعتی وجود دوربین لگا کر بھی نظر نہیں آتا، مگر اب کچھ برف پگھلتی نظر آرہی ہے۔ دراصل مسئلہ وسائل اور باصلاحیت افراد کی قلت کا نہیں بلکہ بنیادی مسئلہ شعور کی بالیدگی اور شدتِ احساس کے فقدان کا ہے۔ ہم نکاح خوانی کی محفلوں اور روایتی جلسوں میں شرکت کے لیے سات سمندر پار بھی جاسکتے ہیں مگر دین وملت کے حوالے سے بڑی سے بڑی قیامت سر سے گزر جاتی ہے مگر اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر پریس کے سامنے دو بول بولنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں۔ زاویۂ فکر کے اس رخ پر بھی سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ اگر کوئی مخالف کیمپ کا مولوی ہمارے جماعتی نظریے کے خلاف تقریر کر کے چلا جائے تو دوسرے ہی دن اس کی تردید میں کل ہند کانفرنس کا نقشہ زمین پر اتار دیا جاتا ہے اور لاکھوں لاکھ کا سرمایہ جمع بھی ہو جاتا ہے اور ایک ہی رات میں صاف بھی۔ اس کے برخلاف میڈیا میں ہماری جماعتی شہ رگ پر نشتر چلتے رہتے ہیں مگر نہ ہماری منجمد رگوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہماری انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اے کاش کوئی مردِ درویش علماے اہلِ سنت کے کانوں میں میرا یہ پیغام پڑھ کر دم کردے کہ جلسوں اور کانفرنسوں کی آواز دو چار فرلانگ پہنچتی ہے اور میڈیا کی آواز دنیا کے کناروں تک گونجتی ہے۔ ہمارے جلسوں میں غیر تربیت یافتہ اور ان پڑھ شریک ہوتے ہیں۔ جب کہ میڈیا کی تجزیہ کاری سے ہر طبقۂ انسانی متاثر ہوتا ہے۔

ایک شام اشرفیہ کے نام

"یہ ہے میرا وطن" کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے ہم سوچ ہی رہے تھے کہ قلم فرسائی کا آغاز کہاں سے کریں۔ غیر اختیاری طور پر ہمارے دیدۂ شوق کی جھیل میں بھیونڈی کی وہ حسین شام اتر آئی جسے تنظیم علماے اہلِ سنت بھیونڈی نے پورے اہتمام شوق اور سلیقہ مندی سے سجا کر الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے نام منسوب کیا تھا۔ ۲۰/نومبر ۲۰۰۹ء میں منعقد ہونے والی اس عظیم اور پرکشش پروگرام کا عنوان تھا "ایک شام اشرفیہ کے نام"۔

ممبئی ہندوستان کا انتہائی مستحکم تجارتی شہر ہے، یہاں بھیا گیری اور دادا گیری بھی خوب چلتی ہے۔ اب بال ٹھاکرے اور راج ٹھاکرے نے "مراٹھا گیری" کے لیے دہشت پھیلا رکھی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں کہ ممبئی کو عروس البلاد کہا جاسکے۔ ہوسکتا ہے بعض سواحلی علاقوں کی شعری پیکریت، تجسیمی موسیقیت اور جمالیاتی ذوقیت کی فراوانی سے متاثر ہو کر اہلِ ادب نے عروس البلاد لکھنا شروع کر دیا ہو۔ ممبئی کے پہلو میں ایک مشہور صنعت نگری ہے جسے بھیونڈی کہا جاتا ہے۔ اس دس لاکھ آبادی والی آبادی میں لاکھوں پاور لوم پر شب وروز کپڑا تیار ہوتا ہے جس سے دنیا کے کروڑوں غریبوں کا تن بھی ڈھکا جاتا ہے اور امیروں اور مہ جبینوں کی پوشاکیں بھی بنتی ہیں۔

بھیونڈی مذہبی اعتبار سے بھی اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ یہاں کی درگاہوں اور مذہبی تقریبات میں عشق وعرفان کے مناظر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ سنت کی قدیم روایتیں پورے طور پر باقی ہیں۔ سلف کے حق پرستوں سے قوم کے فکر وعمل کا رشتہ جتنا مضبوط ہو گا وہ قوم فکری اور اعتقادی کج روی سے اتنی ہی محفوظ رہے گی۔ بھیونڈی میں مساجد کی تعداد ایک سو پچاس ہے جس میں ایک سو دس مساجد میں اہلِ سنت امام ہیں۔ قابلِ مبارک باد ہیں اہلِ بھیونڈی اور علماے بھیونڈی جنھوں نے اپنے مذہبی سرمائے کو غیروں کی دست درازی سے محفوظ رکھا۔ علماے بھیونڈی نے بتایا کہ بھیونڈی میں اسلام وسنیت کے تحفظ وفروغ میں کلیدی کردار حضرت مولانا عبد الشکور اعظمی مصباحی علیہ الرحمہ کا رہا ہے۔ مکاتب ومدارس کی بھی خاصی تعداد ہے ان میں دار العلوم دیوان شاہ اور دار العلوم امجدیہ بڑے ادارے ہیں۔ اہلِ سنت کے مکتبے بھی ترویج حق اور اشاعتِ دین کا کام انجام

Mubarakhusain@ymail.com

دیتے رہے ہیں۔ کبھی بھیونڈی سے اہلِ سنت کا ترجمان ماہ نامہ "المیزان" بھی نکلتا تھا۔ المیزان کے مدیرِ اعلیٰ بھی فاضلِ اشرفیہ تھے۔ "المیزان" کا امام احمد رضا نمبر آج بھی رضویات کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہے امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت وفکر پر کسی جریدے کا اتنا وقیع نمبر ہندو پاک میں آج تک نہیں نکلا۔ اس سفر میں دیکھا کہ بھیونڈی سے ایک نیا ماہ نامہ "پاسبان جدید" بھی جاری ہوا ہے۔ پاسبان کا نام سنتے ہی پاسبانِ ملت علامہ مشتاق احمد نظامی کی یاد تازہ ہو گئی۔ پاسبانِ ملت اپنے عہد کے عظیم خطیب اور قلم کار تھے، مگر افسوس! ان کے علمی اور فکری کارناموں کی ایسی قدر نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ ہو سکتا ہے "پاسبانِ جدید" بھیونڈی اس کمی کو پورا کرے۔ ہماری نیک خواہشات "پاسبانِ جدید" کے ذمہ داروں سے وابستہ ہیں۔

۱۸/نومبر کو سینٹرل مدرسہ بورڈ کے ڈرافٹ میں ترمیم واصلاح کے حوالے سے جامعہ البرکات علی گڑھ میں آل انڈیا مدرسہ کوآرڈینیشن کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ ۱۹/نومبر کو علی گڑھ سے دہلی ہوتے ہوئے ۲۰/نومبر کو ممبئی پہنچا۔ محب گرامی قاری شرف الدین مصباحی ناظم دفتر اشرفیہ ممبئی اور جناب فیضان عزیزی ممبئی مسلسل رابطے میں تھے۔ جناب قاری شرف الدین مصباحی کا شدید اصرار تھا کہ میں ان کی مسجد میں نمازِ جمعہ میں خطاب کروں، مگر میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان سے معذرت کی۔ اسٹیشن سے جناب فیضان عزیزی صاحب کی گاڑی سے انھیں کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ جناب فیضان عزیزی صاحب ایم. بی. اے. کے بعد ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، اسلامیات اور مسلمانانِ عالم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، جماعتی مسائل کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی بعض علما کے بے جا مسلکی تشدد اور تعمیری امور میں جمود وتعطل پر ماتم کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات جماعتی مسائل پر ان کے تبصرے سخت ہو جاتے ہیں مگر بروقت تفہیم کے بعد اسی لمحے وہ اپنا قبلۂ فکر بھی درست کر لیتے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ موصوف فکری دہشت گرد نہیں بلکہ سنجیدہ اور معاملہ فہم ہیں فیضان عزیزی صاحب ایک کامیاب قلم کار ہیں، اب تک ان کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں — (۱) جہاد (۲) ۱۸۵۷ء میں مدارس کا کردار (۳) قربانی۔

جناب فیضان عزیزی نے مجھے تنظیم علماے اہلِ سنت بھیونڈی کا دعوت نامہ دکھایا تو میرے نورِ بصیرت کی لَو تیز ہو گئی۔ کسی قدر بڑے سائز کے کارڈ پر ایک جانب مدعو علما ومشائخ کے اسماے گرامی اور پروگرام کی تفصیل تھی۔ جب کہ دعوت نامے کی پشت پر جامعہ اشرفیہ کا ایک مختصر اور جامع تعارف۔ دعوت کے ساتھ ایک انٹری پاس بھی تھا، اس کا واضح مطلب تھا کہ کانفرنس ہال میں اسی کی انٹری ہو سکتی ہے جس کے ہاتھ میں پاس ہو گا۔ کسی دینی اور علمی تقریب میں شرکت کے لیے بالکل پہلی بار انٹری پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بھیونڈی میں جشنِ اشرفیہ کا نظم دیکھ کر میری نگاہیں اس شاہین صفت فاضلِ اشرفیہ کی متلاشی تھیں، اس پروگرام کے پیچھے جس کی اعلیٰ دماغی اور بلند عزمی کام کر رہی تھی۔ منتظمین جشن کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پورے پروگرام کے روحِ رواں مولانا محمد اکرم اشرفی مصباحی ہیں جو سادہ مزاج اور متواضع فطرت ہونے کے باوجود کام کی مشین اور عزم کے پہاڑ ہیں۔ جامعہ اشرفیہ سے ہر سال سیکڑوں افراد فارغ ہوتے ہیں مگر مولانا محمد اکرم مصباحی جیسے وفا شعار اور اشرفیہ نواز کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا محمد اکرم مصباحی نے اپنے ساتھ اپنے ہی جیسے علما کی ایک ٹیم بنالی ہے۔ ان میں سے کچھ نام اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں۔

۱. حافظ محمد دانش بوبیرے امام شکر شاہ سنی جامع مسجد چوڑی محلہ۔
۲. حافظ محمد شاہد حسین شافعی، امام چاند تارا مسجد نظام پور۔
۳. مولانا محمد علی نظامی خطیب وامام ہدیٰ مسجد کنیری۔
۴. مفتی محبوب رضا مصباحی، نوری دار الافتا سنی جامع مسجد کوٹر گیٹ۔
۵. مولانا زین العابدین امام سنی جامع مسجد غیبی نگر۔

ایک اور اہم نام مولانا یوسف رضا نوری صدر رضا اکیڈمی بھیونڈی کا ہے۔ بھیونڈی میں ان کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جشنِ اشرفیہ کی بھیڑ بھاڑ میں ہم گردن اٹھا اٹھا کر مولانا وقار عزیزی کو بھی تلاش کر رہے تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چند روز قبل سفر حج وزیارت کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس مبارک سفر کو ہم سب کے لیے مبارک فرمائے۔ آمین۔

بعد نمازِ مغرب پیرِ طریقت حضرت عزیزِ ملت مدظلہ العالی نے اسلامی طرز پر بھیونڈی میں دفتر اشرفیہ کا افتتاح فرمایا۔ فی الحال یہ دفتر ۱۴۰۰ کوٹر گیٹ مسجد کے سامنے رضا اکیڈمی کے دفتر کے نیچے ہے۔

تنظیم علماے اہل سنت بھیونڈی نے مینا تائی ٹھاکرے ہال تین بتی بھیونڈی میں جشن اشرفیہ (ایک شام اشرفیہ کے نام) کا اہتمام کیا تھا۔ جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو فرطِ مسرت سے پورا وجود جھوم اٹھا۔ وسیع ہال کی کرسیاں فرشِ زمین سے بالکنی تک بھری ہوئی تھیں۔ اسٹیج علماے کرام اور ائمۂ مساجد سے کہکشاں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اسٹیج کے چھت بوس بینر پر جامعہ اشرفیہ کی مرکزی بلڈنگ دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ مولانا شرف الدین مصباحی جامعہ کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے تعاون کے روایتی طریقوں کی توضیح و تشریح کر رہے تھے۔ مولانا سید سیف الدین اپنے خطاب سے فارغ ہو چکے تھے، مولانا محمد اکرم مصباحی نے انتہائی موثر انداز میں اپنی تحریک کے پس منظر اور پیش منظر کو پیش کیا اور اپنے معاونین اور ہم سفر حضرات کا نام بہ نام شکریہ ادا کیا اور اپنے آئندہ منصوبوں کا اظہار کرتے ہوئے وفاکیشانِ سنیت کو ہم قدم و ہم سفر بننے کی پر خلوص دعوت دی۔ مولانا اکرم مصباحی کا لہجہ خطیبانہ تو نہیں تھا مگر "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کا جلوہ سامعین کی پر شوق پیشانیوں سے پھوٹا پڑتا تھا۔ اخلاص کی لو مدھم ہوتی ہے مگر اس کی روشنی دیر تک اور دور تک ہوتی ہے۔ مولانا یوسف رضا نوری بھیونڈی ایک نام ور داعی اور خطیب ہیں۔ انھیں سننے کا میرا بالکل پہلا اتفاق تھا۔ ماشاء اللہ دل نشیں اسلوب میں بڑا اثر انگیز خطاب فرماتے ہیں۔ موصوف نے اہل بھیونڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ اشرفیہ ہندوستان میں اہلِ سنت کی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اس کا سالانہ تعلیمی بجٹ دو کروڑ سے زیادہ ہے۔ مولانا نے کہا کہ یہ بجٹ ہمارے جماعتی وجود کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ اس بجٹ کو تو صرف بھیونڈی کے اہل خیر مکمل کر سکتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ہماری مشترکہ ذمے داری ہے کہ ہم جامعہ اشرفیہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا بھرپور تعاون کریں۔ مولانا نے بھیونڈی کے اہل خیر سے ہاتھ اٹھا کر وعدہ لیا کہ امسال ہمارے کارواں نے ڈھائی لاکھ کی گنتی کی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ سال ہم ۲۵/ لاکھ کا نشانہ پورا کریں گے۔

مولانا فخر الدین حشمتی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اب انھوں نے تنویر عطاری کو ترانۂ اشرفیہ پڑھنے کی دعوت دی۔ جناب تنویر عطاری نے نعتِ رسول ﷺ سے ماحول مشک بار کیا اور پھر ترانۂ اشرفیہ چھیڑ کر مجمع پر چھا گئے۔ حسان الہند حضرت بیکل اتساہی کے لکھے ہوئے اس ترانے کا بند ہے۔ "اشرفیہ ہے باغ ہمارا ہم ہیں اس کے پھول۔ ہماری منزل عشقِ رسول۔"

علما کی گل پوشی کے بعد مبالغہ آرائیوں کی تمام حدود کو پار کرتے ہوئے مجھے دعوتِ خطاب دی گئی۔ میں نے بھی اپنے کج مج لہجے میں علم کی اہمیت، علماے ہند کی ہمہ گیر خدمات، امام احمد رضا کا علمی مقام امتیاز اور جامعہ اشرفیہ کی تاریخی خدمات پر روشنی ڈالی اور خاص طور پر جامعہ اشرفیہ کے رواں شعبوں کا تعارف پیش کیا۔

آخری اور اہم خطاب شہزادۂ حافظِ ملت علامہ شاہ عبد الحفیظ صاحب سربراہِ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ کا ہوا۔ آپ نے معاونین اور مخلصین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فکرِ رضا کی ترویج و اشاعت میں اشرفیہ کی وسیع خدمات پر گفتگو فرمائی۔ بارگاہ رسول ﷺ میں نذرانۂ سلام کے بعد جشن کے دولھا عزیز ملت دامت برکاتہم العالیہ کی پر سوز دعاؤں پر اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔

ممبئی کے مختلف اردو اخبارات میں اس پروگرام کی تفصیلات شائع ہوئیں۔ ذیل میں ہم "مسلم ٹائمز" ممبئی کی رپورٹ نقل کرتے ہیں۔

مہاراشٹر کے صنعتی شہر بھیونڈی میں مورخہ ۲۰/ نومبر ۲۰۰۹ء کو "ایک شام الجامعۃ الاشرفیہ کے نام" ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ایشیا کی عظیم دینی و علمی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ کے رابطہ دفتر کا قیام عمل میں آیا۔ تقریب کا اہتمام بھیونڈی کی مشہور و متحرک تحریک "تنظیم علماے اہل سنت" نے کیا تھا۔ اس موقع پر شہر کی سرکردہ شخصیات اور الجامعۃ الاشرفیہ سے گہری عقیدت رکھنے والے حضرات نے کثرت کے ساتھ شرکت کی۔ اسی دن بعد نمازِ عشا ایک عظیم الشان جلسہ مینا تائی ٹھاکرے ہال میں منعقد ہوا، جس میں علما، طلبہ اور عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جلسہ آغاز قرآن مقدس کی تلاوت سے ہوا بعدہ تنویر عطاری، عادل عطاری نے بارگاہِ رسالت میں نعت پاک کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ممبئی سے تشریف لائے فاضل نوجوان حضرت مولانا سید سیف الدین اصدق نے علم دین کی اہمیت اور اشرفیہ کے تعارف پر مبنی پر مغز خطاب فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ حضور حافظ ملت نے علم دین کی جو شمع مبارک پور میں جلائی تھی آج ساری دنیا میں اس کی چمک ہے۔ تنظیم کے روحِ رواں حضرت مولانا اکرم اشرفی نے جامعہ اشرفیہ کا تعارف پیش کیا۔ بعدہ مولانا یوسف رضا نے خطاب فرمایا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی سے قبل قائم اس ادارے نے دنیاے اسلام کو ایسے ایسے آفتاب و مہتاب دیے جن کی ضیائیں عالم کو منور کر رہی ہیں۔ علامہ قمر الزماں مصباحی جیسے مفکر و مدبر، حضرت علامہ ارشد القادری جیسے مناظر و نباضِ قوم، مولانا یٰسین اختر مصباحی جیسے مصنف، علامہ ضیاء المصطفیٰ، بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی جیسی شخصیات جن پر دنیاے اسلام

فخر کرتی ہے، وہ یہیں سے پروان چڑھیں۔

ماہ نامہ اشرفیہ کے چیف ایڈیٹر مولانا مبارک حسین مصباحی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علم کا حاصل کرنا بھی عبادت ہے۔ تعلیم ترقی کی بنیاد ہے، بغیر اس کے ترقی کا تصور ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ زور حصولِ علم پر ہی دیا ہے۔ علم قوموں کو ترقی و عروج عطا کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ الجامعۃ الاشرفیہ میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے ہم آہنگ کئی اہم شعبے ہیں جن میں قابلِ ذکر تقابلِ ادیان اور کمپیوٹر انفارمیشن کا شعبہ ہے جس کی اہمیت سے عصرِ حاضر میں انکار نہیں کیا جا سکتا تا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے علما دنیاے اسلام پر اٹھنے والی ہر طاغوتی طاقت کا جواب دے سکیں۔ وہ عیسائیت ہو یا یہودیت، یا پھر دوسرے مذاہب کے اعتراضات ہوں، وہ ہر اعتراض کا دندان شکن جواب دیں اور لوگوں کو مذہبِ اسلام کی دعوت دیں۔

اخیر میں الجامعۃ الاشرفیہ کے سربراہِ اعلیٰ حضرت علامہ عبد الحفیظ عزیزی نے خطاب فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ علم انبیا کی میراث ہے۔ حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ نے ۱۹۳۵ء میں دار العلوم اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ ایک خستہ حال عمارت تھی جہاں سے اس کی ابتدا کی گئی، مگر حافظِ ملت نے اپنے خونِ جگر سے اسے سینچا اور مدرسہ سے دار العلوم اور دار العلوم سے آج جامعہ کی شکل میں نہ صرف ایک عمارت بلکہ علم و ادب کا ایک پورا شہر آباد ہے، جہاں سے ہندو پاک کے ہزاروں طلبہ زیورِ علم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ حضور حافظ ملت ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "ہر مخالفت کا جواب کام ہے"۔ انھوں نے ایک عظیم جامعہ ہمیں عطا فرمایا جس پر دنیاے سنیت جتنا فخر کرے، کم ہے۔ صلاۃ و سلام کے بعد رقت انگیز دعاؤں کے ساتھ جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ جلسہ کی نظامت مولانا فخر الدین حشمتی نے کی۔ اس میں عوام کے علاوہ کثیر تعداد میں علماے کرام اور ائمہ مساجد نے شرکت کی۔

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں

اندور میں

مولانا محمد صادق رضا صاحب

دار العلوم نوری، متصل درگاہ شریف

کھجرانہ، اندور، (ایم پی)

وفیات

مفتی مجیب الاسلام نسیم اعظمی نہیں رہے

اہلِ سنت کی مقتدر شخصیت، مفتی مجیب الاسلام صاحب نسیم اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر شعبۂ افتا جامعہ شمسیہ تیغیہ بھدوہی وارانسی و بانی جامعہ رضویہ ضیاء العلوم، ادری ضلع مئو یو. پی. شبِ یکشنبہ ۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ کو دار الفنا سے دار البقا کی طرف کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آج دنیاے سنیت ایک ایسی برگزیدہ شخصیت سے محروم ہو گئی جو اپنی بے لوث دینی خدمات اور علوم و فنون میں ممتاز تھی۔ مفتی اہلِ سنت مجیب الاسلام صاحب نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ فتویٰ نویسی اور درس و تدریس میں گزارا۔ آپ نے مندرجہ ذیل جلیل القدر علما سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ صدر الشریعہ حضرت مفتی امجد علی اعظمی، تاج دارِ اہلِ سنت مفتی اعظم ہند حضرت مصطفیٰ رضا، محدثِ اعظم پاکستان علامہ سردار احمد، شیر بیشہ اہلِ سنت حضرت علامہ حشمت علی خاں و دیگر عظیم المرتبت شخصیتوں کی صحبت پائی۔ اسی اکتسابِ فیض نے مجیب الاسلام کو بقیۃ السلف حضرت مجیب الاسلام نسیم اعظمی بنا دیا۔ ایسی گراں قدر ہستی ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئی جو اپنے دور کی بے مثال شخصیت تھی: ع — ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

ضلع دیوریا سلیم پور میں مفتی صاحب موصوف کا قائم کردہ دینی قلعہ دار العلوم غوثیہ زندۂ جاوید یاد گار ہے۔ ادری میں مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی ایک پر انوار درس گاہ آج بھی ہے جو ضیاء العلوم کے نام سے مشہور ہے۔ یوں تو آنے جانے کا سلسلہ ابتداے آفرینش سے ہے لیکن دینی و مذہبی خدمات مفتی صاحب موصوف کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ مفتی صاحب کی قائم کردہ مرکزی درس گاہیں دنیاے اسلام کو فیض پہنچاتی رہیں گی۔ رئیس احمد عزیزی و اراکین قادریہ مسجد ہبلی دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ بقیۃ السلف کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کے وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

شریکِ غم۔ رئیس احمد عزیزی ادروی، ہبلی، کرناٹک

صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"۔ اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی۔

مولانا مبارک حسین مصباحی کا ریمارک بالکل حق ہے

فخر صحافت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ تمام مشمولات معلوماتی اور نئی فکر لیے ہوئے ہیں۔ مسائل و مباحث کے کالم میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے تعلق سے مضامین وقت کی اہم ضرورت ہیں۔

مولانا ساجد رضا مصباحی نے مولانا مبارک حسین مصباحی کی تازہ ترین کتاب "شہر خموشاں کے چراغ" پر زور دار اور فکر انگیز تبصرہ کیا ہے۔ بلاشبہہ یہ کتاب کے مقبول ترین ہونے کی علامت ہے کہ اس کے اسلوبِ فکر، طرزِ تحریر اور طرزِ تالیف کی دھمک علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں محسوس کی جا رہی ہے اور اب تک متعدد تبصرے ملک کے معتبر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ماہ نامہ "جام نور" اکتوبر ۲۰۰۹ء میں مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی جے۔ این۔ یو۔ دہلی نے اور ماہ نامہ "کنز الایمان" میں مولانا ناصر رام پوری جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نے معلوماتی اور تنقیدی تبصرے سپردِ قلم فرمائے ہیں۔

اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ مولانا مبارک حسین مصباحی ایک کہنہ مشق قلم کار اور صاحب طرز ادیب و صحافی ہیں۔ ان کی تحریریں فکر انگیز، سادہ، شیریں اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ سابقہ تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب میں ان کا قلم ادبی حسن لیے ہوئے ہے۔ قوم و ملت کی شہرۂ آفاق شخصیتوں کا تذکرۂ جمیل لکھتے وقت انھوں نے فکر و قلم کی ساری توانائیاں صرف کر دی ہیں اور عقیدت و محبت کے ایسے پھول بکھیرے ہیں کہ پوری کتاب لالہ زار بن گئی ہے۔ ۴۸۰/ صفحات پر مشتمل یہ کتاب علوم و فنون، معرفت و طریقت سے متعلق گوناگوں شخصیات کے تذکارِ جمیل کا ایک حسین مرقع ہے۔ آصف رضا مراد آبادی کی رائے کے مطابق "مرحومین علماے اہل سنت کے مجموعی تذکروں پر مشتمل اس نہج کی کوئی کتاب ابھی تک ہندوستان میں منصۂ شہود پر نہیں آئی۔"

مولانا ساجد رضا مصباحی نے مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کی تنقید پر اچھی گرفت فرمائی ہے۔ یقیناً اگر مولانا علیمی شبلی نعمانی و سلیمان ندوی کی سیرت النبی کا مطالعہ کرنے کے بعد صدر العلما علامہ محمد احمد مصباحی کی معرکہ آرا تصنیف "تنقید معجزات کا علمی محاسبہ" کا بچشمِ انصاف مطالعہ کریں تو ان کی عقیدتوں کا شیش محل زمیں بوس ہو جائے گا۔

علامہ محمد احمد مصباحی نے شبلی نعمانی اور ان کے ہم نواؤں کے فکری مزاج اور سیرت النبی کے پیچھے کار فرما محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے مولوی زکریا کاندھلوی کے حوالے سے مندرجہ ذیل تین خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں:

(۱) - اس دور میں اگرچہ سیرتِ نبوی پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، لیکن ان کے مؤلفین و مصنفین زیادہ تر فلسفۂ جدیدہ اور یورپ کے فلاسفروں سے اس قدر مرعوب اور خوف زدہ ہیں کہ یہ چاہتے ہیں آیات و احادیث کو توڑ مروڑ کر کسی طرح فلسفہ اور سائنس کے مطابق کر دیں۔

(۲) - یہی وجہ ہے کہ جب معجزات و کرامات کا ذکر آتا ہے تو جس قدر ممکن ہوتا ہے اس کو ہلکا کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں راویوں پر بس چلتا ہے تو جرح و تعدیل کے ذریعہ سے محدثانہ رنگ میں ان کی روایات کو ناقابلِ اعتبار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جہاں راویوں پر بس نہیں چلتا وہاں صوفیانہ اور محققانہ رنگ میں تاویل کی راہ اختیار کی جاتی ہے، جس سے آیت اور حدیث کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔

(۳) - اور جب خداوند ذو الجلال کے باغیوں سے جہاد اور قتال کا ذکر آتا ہے تو پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اس کو اسلام کے چہرے پر بد نما داغ سمجھ کر دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہ ہوا کہ اعداء اللہ سے جہاد کی آیات اور احادیث کا انکار کر دیں۔ اس لیے تاویل کی راہ اختیار کی کہ یہ غزوات اور سرایا اعلاے کلمۃ اللہ یعنی اللہ کا بول بالا کرنے اور آسمانی بادشاہت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو علی الاعلان جاری کرنے کے لیے نہ تھے بلکہ محض اپنی حفاظت اور جان بچانے اور دشمنوں کی مدافعت کے لیے تھے۔ (تنقید معجزات کا علمی محاسبہ)

اس تناظر میں مولانا مبارک حسین مصباحی کا یہ ریمارک کہ "شبلی و سلیمان کی سیرت النبی اور ابو الکلام آزاد اور سلیمان منصور پوری وغیرہ کی سیرت کے موضوع پر کتابیں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے خالی ہیں۔" بالکل حق اور تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ اس پر چیں بجبیں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

آصف رضا مراد آبادی نے بھی مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کو تبصرے کے آداب و اصول سکھانے کی کوشش کی ہے۔ نہیں معلوم انھوں نے یہ اصول کسی کتاب سے نقل کیے ہیں یا اپنے ذہن سے، لیکن ان کے خیالات سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ مبصر کا مقصد کتاب کے ادبی اور اہم گوشوں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے، خود تبصرے کے اصول و آداب کے خلاف ہے۔ نیز ان کا یہ کہنا کہ مولانا علیمی کے تبصرے سے کتاب کے لیے نفرت کا سامان مہیا ہوتا ہے، خلافِ واقعہ اور سراسر غلط ہے۔ فقط

سید گوہر ربانی، باندہ

جماعت اہلِ سنت کے لیے آپ کی تنظیمی کاوشیں وقیع ہیں

بخدمت وقارِ صحافت، محترم و مکرم مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب دامت برکاتہم، مدیرِ اعلیٰ ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور

جنابِ والا ------------------ مزاجِ گرامی!

خدمتِ اقدس میں ایک کتاب بنام "مرقعِ انوار" مشتمل بر حالات و خدماتِ جلیلہ شیخ الاسلام حضرت ابو البرکات شاہ محمد انوار اللہ فاروقی رحمۃ اللہ تعالیٰ بانیِ ازہر ہند جامعہ نظامیہ، دائرۃ المعارف العثمانیہ و دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف برائے مطالعۂ خصوصی و تبصرہ در ماہ نامہ اشرفیہ پیشِ خدمت ہے۔ چار پانچ سال قبل مختصر سی ملاقات یہاں حیدر آباد میں آپ سے رہی۔ ماشاء اللہ جماعت اہلِ سنت و جماعت کے لیے آپ کی تحریری، تنظیمی اور تفکیری کاوشیں الجامعۃ الاشرفیہ اور ماہ نامہ اشرفیہ کے حوالے سے وقیع بھی ہیں اور وسیع بھی۔ اللہ پاک بطفیل حبیبِ پاک و آلِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حفاظت فرمائے، نظرِ بد سے بچائے اور آپ کی بے لوث، بے لاگ، بے باک خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ یاد آتا ہے مفتی نظام الدین صاحب کے ذریعہ ایک اور کاوش "علماے حیدر آباد و بریلی کے علمی روابط" خدمتِ گرامی میں ارسال کیا تھا۔ پرسانِ احوال کی خدمت میں سلام عاجزانہ۔ فقط والسلام

عبد ضعیف

شاہ محمد فہیم الدین نظامی، مہتمم کتب خانہ جامعہ نظامیہ حیدر آباد

حافظ ملت اور اصلاحِ امت بہت ہی جامع مضمون ہے

محترم مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب۔ سلام و رحمت

اشرفیہ نومبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ فیضی کتاب گھر، بیتا مڑھی سے حاصل ہوا۔ اعزازی طور پر رسالہ میرے نام جاری ہے۔ مگر دو بار تقاضے کے بعد دو دو شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ تاخیر کا سبب نہیں معلوم۔ اگر اعزازی طور پر بھیجنے کی مدت ختم ہو گئی ہو تو مجھے اطلاع کریں، کرم ہو گا۔

آپ کا اداریہ "مرکزی مدرسہ بورڈ" میں آپ نے اقتدار پر قبضہ جمانے والوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ہمارے نیپال کی سیاسی جماعت میں ماؤنوازوں کا بھی یہی حال ہے۔ پرچنڈ کا کہنا ہے کہ میری سربراہی میں سرکار بنے تو ٹھیک ورنہ میں نہیں مانوں گا۔ علماے دیوبند ہمیشہ سے اقتدار کی کرسی کے طلب گار رہے ہیں اور رہیں گے بھی۔

"مالِ قرض پر زکوٰۃ کے احکام" کی تفصیل کے مطالعہ سے فیض یاب ہوا اور اطمینانِ قلب حاصل ہوا۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کی چوتھی قسط اپنی جولانیوں کے ساتھ ذہن و دماغ کو جھنجھوڑتی رہی۔

"سوائن فلو - تحقیق و تنقید" میں محمد نور الاسلام نے ایک بات کی طرف جو اشارہ دیا ہے وہ قابلِ غور ہے کہ برڈ فلو سے نجات کے لیے مرغیوں کا قتلِ عام کیا مگر سوائن فلو سے بچنے کے لیے خنزیروں کو مارنے کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔

"علم کیمیا کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" محمد ضیاء الدین برکاتی کا بڑا ہی معلوماتی مضمون ہے۔ اسے پڑھ کر اپنے پیش رو اکابرین کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر یا تارخ" پر بڑی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جو معلومات کو پختہ اور یقینی بناتا ہے۔ حوالہ جات کی کثرت نے مضمون کو جامع بنا دیا ہے۔

"حافظِ ملت اور اصلاحِ امت" محمد شاہد علی رضوی فیضانی کا بہت ہی جامع مضمون ہے جس میں حضور حافظِ ملت اور کارنامہ حیات کے نئے گوشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ حضور حافظِ ملت کی ہمہ گیر شخصیت کی کارکردگی کا احاطہ کرنا مشکل تو ہے مگر ان کی حیات کے نئے گوشوں کو اجاگر کرنا بھی ضروری ہے۔

"قاضی شہر کان پور مولانا قاضی عبد السمیع" کی شخصیت پر لکھا گیا آپ کا مقالہ قابلِ ستائش ہے۔ ان کی شخصیت پر مختصر مگر جامع

مضمون ہے، گویا کہ سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ "حضرت شاہ عزیز احمد ابو العلائی قدس سرہ ایک مرد مجموعۂ محاسن" مختصر میں کسی کی شخصیت پر جامع مضمون اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

"ہائے ایسے بھی سیاست میں مقام آتے ہیں" پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کے مضمون نے رُلا دیا ہے۔ اربابِ اقتدار کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہی ملک میں بد امنی پھیلتی ہے اور ملک سیاسی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ "انصاف کو آواز دو انصاف کہاں ہے" "بزم دانش" کی تحریریں، "آئینہ در آئینہ" کے تحت ماہ نامہ اشرفیہ کے ایک سال کے اشاریے، "صدائے بازگشت" میں قارئین کے خطوط اور دیگر تمام مشمولات لائقِ مطالعہ اور علم میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ میں اشرفیہ کو شروع سے اخیر تک کئی بار پڑھتا ہوں اور سرور و نور سے مستفیض و مستفید ہوتا ہوں۔

حضور حافظِ ملت کی شان میں ایک منقبت جو بالکل تازہ ہے، پسند آجائے تو شائع فرما دیں خط طویل ہے، اختیار آپ کو ہے۔

خیر اندیش- **ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی**، سرلاہی، نیپال

تلہر میں اشرفیہ کے قارئین میں اضافہ ہوا ہے

فخر صحافت لائقِ صد احترام حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب دام ظلہ النورانی---- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مادرِ علمی کا موقر جریدہ پوری آب و تاب کے ساتھ نظر نواز ہوتا ہے۔ تمام مشمولات خوب سے خوب تر اور قابلِ ستائش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک اس کے قارئین کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ قصبہ تلہر ضلع شاہجہان پور میں بھی گزشتہ چند سال سے اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور لوگوں میں اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔

قصبہ تلہر بہت سے علما اور صوفیہ کی جائے پیدائش اور ان کا مدفن ہے۔ انھیں میں ایک شخصیت علامہ شاہ لیاقت حسین صدیقی علیہ الرحمہ کی ہے۔ آپ کے مریدین و معتقدین کی اطرافِ ہند میں ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ تلہر کے بعض معتقدین کی خواہش ہے کہ ماہ نامہ اشرفیہ میں علامہ لیاقت حسین علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر مشتمل ایک مضمون شائع ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ انھیں کی خواہش کے پیشِ نظر اور بالخصوص الحاج حکیم محمد صالح عرف شدن میاں مد ظلہ العالی جو حضرت کے شہزادے اور جانشین ہیں، کے حکم پر ناچیز نے "حضرت مولانا لیاقت حسین صاحب علیہ الرحمہ" کے عنوان سے ایک مضمون ترتیب دیا ہے جو آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اگر ہو سکے تو کرم فرما کر قریب کے شمارے میں جگہ عنایت فرمائیں! نوازش ہوگی۔

فقط **محمد رضا حسین مصباحی**، تلہر، شاہجہان پور

طلبۂ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ اور لائحۂ عمل

مکرمی------------------سلام مسنون

عصر حاضر میں مدارس و مکاتب کی کمی نہیں، نیز ان میں تعلیم و تعلم میں مصروف متعلمین و معلمین کی بھی کچھ کمی نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج ملکی سطح پر طلبہ کی بڑی تعداد مدارس کا رخ کرتی ہے تو دوسری طرف اچھی خاصی تعداد اپنا تعلیمی سفر طے کر لیتی ہے۔ اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ آج جدید فارغ التحصیل علما کی طویل فہرست میں زبان و بیان پر قادر، درس و تدریس میں ماہر، ذی استعداد اور باصلاحیت افراد کی قلت باعثِ تشویش اور قابلِ حیرت ہے۔ لیکن اس قضیہ کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ دورِ حاضر میں مذکورہ بالا صفات کے حامل علما کا من کل الوجوہ فقدان ہے، قطعاً نہیں۔ کیوں کہ فی زماننا ذمہ دار علمائے کرام کا ایک حساس طبقہ موجود ہے جس کا ہر فرد دعوت تبلیغ میں کسی نہ کسی جہت سے اپنی دینی، ملی اور سماجی ذمہ داریوں پر حتی الوسع کاربند ہے۔ ان کے وجود کی نفی چمکتے ہوئے سورج کے وجود کی نفی کے مترادف ہے۔

ہاں! یہ پہلو باعثِ تاسف ضرور ہے کہ موجودہ مدارس میں مقیم قدیم اور نو داخل طلبہ اپنے تعلیمی سال اور نصابِ تعلیم کے آغاز کے وقت پہلے اپنا کوئی مخصوص ہدف متعین نہیں کرتے جس کے حصول کی خاطر وہ فکر مند اور حساس رہ سکیں اور نہ ہی اپنے اسباق کے حفظ اور اوقات کے ضبط میں معاون کوئی اصول بناتے ہیں جس کی پابندی ان کی شخصیت کو باکمال اور ان کے مستقبل کو تابناک بنا سکے، بلکہ بلا نظم و ضبط مختلف عناوین پر مشتمل کتب کے مطالعہ اور غیر ضروری رسائل و جرائد کی ورق گردانی میں بے تحاشا وقت صرف کر دیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بے ترتیبی اور بے ڈھنگی کے ماحول

میں آٹھ دس سال کا طویل عرصہ محض تعلیم و تربیت کے نام ہو کر رہ جاتا ہے، جس کا منفی نتیجہ یہ بر آمد ہوتا ہے کہ سالِ فراغت یا بعدِ فراغت کفِ افسوس ملنے کی نوبت آپڑتی ہے کہ اب کیا کریں؟

کیوں کہ نہ عبارت خوانی درست، نہ مراد ماتن تک رسائی کی صلاحیت، حتی کہ معرفتِ صیغہ سے جہالت، واضح رہے کہ یہ حقیقت متذکرہ محض فکری اور ذہنی سطح پر ابھرنے والے خیالِ خام کی منزل میں نہیں ہے بلکہ نفس الامر میں ثابت، ٹھوس تجربات اور عینی شواہد پر مشتمل ہے، جب کہ درحقیقت مدارس میں آٹھ دس سال کا زمانہ علوم عربیہ [نحو، صرف، معانی و بلاغت اور ان سے متعلق و معاون علوم میں یک گونہ مہارت و ممارست کا دور ہوتا ہے] اب اس دوران طالب علم اپنی محنت و مشقت اور سمجھ بوجھ سے جتنا بھی محفوظ کر لیتا ہے اسی قدر درسیات عربی ادب اور اسلامی معلومات پر مشتمل رسائل و جرائد سے افادہ و استفادہ کی لیاقت بھی اپنے اندر پاتا ہے، پھر اسی کی روشنی میں اپنی صواب دید کے مطابق بتدریج تفسیر، حدیث، کلام، فقہ اور دوسرے فنون کی معتبر و مستند کتب جنھیں ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ متعدد علوم و فنون کے اصل ماخذ و مرجع کی حامل کتب کے کثیر مطالعہ کے سبب وہ اتنی صلاحیت کا مالک ہو جاتا ہے کہ کسی بھی حساس عنوان پر عربی زبان میں مبسوط مقالہ قلم بند کر سکتا ہے۔ نیز اپنے مافی الضمیر اور قلبی واردات کا برملا اظہار بھی عربی زبان میں بسہولت کر سکتا ہے۔ غرض کہ وہ ہر دور میں رائج دعوت و تبلیغ کے موثر ذرائع ابلاغ یعنی تدریس، تصنیف اور تقریر ہر ایک پر کمال حاصل کر لیتا ہے۔ مگر کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے مندرجہ ذیل چند رہ نما اصول کو عملی جامہ پہنانا بے حد ضروری ہے۔

۱. نحو و صرف کی ابتدائی کتب کی بنیادی اور ضروری تمام قواعد کو اچھی طرح محفوظ کرنا، پھر دورانِ درس ان کی مکمل رعایت کرنا۔
۲. عبارت خوانی کو خوب درست کرنا، ترکیب مضمون اور جملہ کو سمجھنا پھر کلام کے مشکل معانی کو حل کرنا اور مراد مصنف تک رسائی کی سعی کرنا۔
۳. مقالہ اور مضمون نگاری کی بھی عادت ڈالنا اور روزمرہ در پیش حالات و واقعات کو اپنے الفاظ میں قلم بند کرنا۔
۴. دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں سے شائع ہونے والے اردو، عربی ادب پر مشتمل ضروری اور معیاری رسائل و جرائد کا مطالعہ کر کے ان سے مناسب تعبیرات اور مستعمل محاورات اخذ کرنا۔
۵. مذکورہ امور کو باضابطہ بڑے اہتمام سے غیر معمولی جد و جہد کے ساتھ انجام دینا۔

لہٰذا طالبانِ علوم اور متلاشیانِ فنون کے لیے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ وہ ماضی کی تاریخ سے درس حاصل کریں اور حال کے واقعات سے عبرت کا سامان فراہم کریں اور لائحۂ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے تعلیمی سال کے ابتدائی دور سے ہی اپنا نصب العین متعین کریں، ایک مخصوص ہدف بنائیں، اس کے تحت چند ایسے خطوط کی بھی نشان دہی کریں جو مقصد کی تحصیل کے عین موافق اور اس کی تعمیل و تکمیل کے حد درجہ مناسب ہوں، پھر انھیں منتخبہ اصول کی روشنی میں پابندیِ وقت کے مکمل لحاظ کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھیں اور مقصدِ سعید کے حصول کی خاطر پر امید ہو کر شب و روز سرگرداں رہیں۔ فباللہ التوفیق وھو خیر رفیق۔

فقط **محمد عثمان رضوی**، کمہاری، ناگور

ماہ نامہ اشرفیہ اردو مطالعہ کا سبب بنا

حضرت فخر صحافت صاحب قبلہ-سلام مسنون

حصولِ علم کی خاطر عرصۂ دراز گزارنے کے باوجود میں اردو ادب کا شائق نہ بن سکا اور ہمیشہ اردو ادب کے مطالعہ سے راہِ فرار اختیار کرتا رہا۔ مگر ماہ نامہ "اشرفیہ" شمارہ نومبر اور دسمبر ۲۰۰۹ء کے مضامین جوں ہی نظروں سے گزرے تو اس بد ذوقی اور بے رغبتی کا صفایا ہو گیا اور اردو ادب کی اہمیت و افادیت کا چراغ روشن ہو گیا اور ذہن اس بات کے قریب ہوا کہ مقالہ نویسی اور مضمون نگاری ایک اہم فن ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتا۔ اس ذوقِ سلیم کے محرک یوں تو تمام مضامین ہیں مگر ان میں حضرت فخر صحافت صاحب کا اداریہ بنام "مرکزی مدرسہ بورڈ" اور مولانا اسلم رضا قادری کا مضمون "حضرت ابراہیم کے والد آزر یا تارخ" اور مولانا قاضی ظہور احمد اختر کا مضمون "کیا فقہ حنفی قانونِ روما سے ماخوذ ہے؟" قابلِ ذکر ہیں، جو ان حضرات کی اعلیٰ فکر، بلند پایہ تحقیق اور مضمون نویسی میں مہارت کی جانب غماز ہیں۔ رب تعالیٰ ان حضرات کی قلمی طاقت میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین۔

فقط- **محمد شہزاد رضا رام پوری**

☆☆☆

تنظیمی سرگرمیاں

مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام قوم کے مفاد میں ہے .... ممبئی اجلاس کی قرارداد

مرکزی مدرسہ بورڈ قوم اور مدارس کے مفاد میں ہے جو لوگ اس کے قیام کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ سمجھ رہے ہیں انہیں سنجیدگی کے ساتھ مجوزہ مدرسہ بورڈ کے ڈرافٹ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان باتوں کی نشاندہی کرنی چاہیے جس سے ایسی مضر باتیں عیاں ہوتی ہوں تاکہ اس کو نکلوایا جا سکے، کیوں کہ حکومت اپنی جانب سے مسلمانوں پر کوئی بھی چیز زبردستی نہیں تھوپ سکتی، اسے اس طرح کے ہر معاملے میں مسلمانوں کے مشورہ پر عمل کرنا پڑے گا۔ جناب کپل سبل نے یہ بات مسلم ماہرین تعلیم سے کہی بھی ہے کہ وہ جو کہیں گے ہم وہ کرنے کو تیار ہیں اس کے باوجود مدرسہ بورڈ کے قیام کے منصوبے کو یکسر مسترد کر دینا دانش مندی کے خلاف ہے۔ یہ بات مولانا مبارک حسین مصباحی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ وایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور نے آل انڈیا تنظیم ابنائے اشرفیہ کے زیر اہتمام کرلا اسٹیشن مسجد میں منعقد ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے مزید کہا کہ مدرسہ بورڈ کی اسناد سی. بی. ایس. ای. بورڈ کے مساوی ہو جائیں گی اس سے طلبۂ مدارس کے لیے اعلیٰ تعلیم کے راستے کھل جائیں گے پھر وہ مدرسہ کی سند سے ملک کی کسی بھی یونیورسٹی کے پروفیشنل کورسیز میں داخلہ لینے کے اہل ہو جائیں گے۔ اس کانفرنس کی صدارت ایشیا کی عظیم علمی ودینی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ کے سربراہ اعلیٰ علامہ عبد الحفیظ عزیزی صاحب نے کی جس میں علمائے ممبئی اور مصباحی حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

مولانا محبوب رضا مصباحی بھیونڈی نے مرکزی مدرسہ بورڈ کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں مدرسہ بورڈ کی مخالفت کو کسی بھی طور پر مناسب نہیں سمجھتا، ہاں! اس میں مناسب ترمیمات کی بات کہی جا سکتی ہے مگر یکسر اس کی مخالفت کرنا بہر حال اچھی بات نہیں ہے۔ مدرسہ بورڈ بننے کے بعد اس کے دور رس نتائج سامنے آئیں گے۔ اس سے مسلمان اور مدارس دونوں کے حالات میں حیرت انگیز تبدیلی آئے گی۔ اس لیے ضروری ترمیمات کے ساتھ میں مدرسہ بورڈ کی حمایت کرتا ہوں۔

مولانا صابر رضا رہبر مصباحی نے کہا کہ حکومت کا مقصد مدارس اور مسلمانوں کو مدرسہ بورڈ کے ذریعے نقصان پہنچانا ہرگز نہیں ہے کیوں کہ اسے اچھی طرح اس کا احساس ہے کہ اس کی یہ کوشش کبھی بھی کامیاب ہونے والی نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریزوں کی حکومت نے مسلمان اور مدارس کے خلاف کیا کیا ریشہ دوانیاں کیں تاریخ پر نظر رکھنے والے حضرات اچھی طرح واقف ہیں لیکن انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور مدارس آج بدستور اپنی حالت پر قائم ہیں۔ مولانا صادق رضا مصباحی نے کہا کہ جب انگریزوں کے دور حکومت میں عربی فارسی اتر پردیش بورڈ ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا تھا تو اس وقت بھی یہاں کے علما اس طرح کے خدشات کا اظہار کر کے اس کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آئے تھے لیکن بعد میں دنیا نے دیکھا کہ اس طرح کے خیالات خام ثابت ہوئے اور آج مدارس اتر پردیش کو اس سے جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہ بالکل جگ ظاہر ہیں۔ طلبۂ مدارس کی ایک بڑی تعداد اس کے اسناد کے ذریعہ عصری اداروں میں پہنچ رہی ہے۔ اساتذہ کی معاشی حالت بھی اس کی وجہ سے بہتر ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کانفرنس میں بالخصوص مولانا ذوالفقار علی برکاتی، مولانا اشرف الدین مصباحی، ناظم دفتر اشرفیہ ممبئی، مولانا مظہر حسین علیمی، مولانا توفیق مصباحی، مولانا ساجد علی مصباحی، مولانا قاری ضیا نور مصباحی، مولانا رہبر مصباحی، مولانا عرفان علیمی، مولانا ابرار احمد مصباحی، مولانا قمر عالم مصباحی، مولانا عظمت اللہ مصباحی، مولانا عمر نظامی، مولانا عبد القادر رضوی، مولانا طفیل احمد مصباحی، نے شرکت فرمائی۔

(رپورٹ تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ ممبئی۔ صحافت ممبئی۔ مسلم ٹائمز ممبئی)

دار القلم دہلی میں تنظیم ابنائے اشرفیہ کا اجلاس

۴/ دسمبر ۲۰۰۹ء بعد نماز مغرب دار القلم دہلی میں تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ دہلی کا اجلاس ہوا جس میں تنظیم کی تشکیل جدید ہوئی اور اس کے بعد مسلمانوں کے حوالے سے موجودہ مسائل پر غور وفکر کے بعد بہ اتفاق رائے چند تجاویز پاس کی گئیں۔ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے تنظیم ابنائے اشرفیہ کے کل ہند جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے کہا کہ مسلمانوں پر پچھلے پچاس سالوں میں اتنا ظلم ہوا ہے کہ وہ منفی ذہنیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اب انہیں ہر چیز سے ڈر اور خوف لگنے لگا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس تشکیک سے باہر آئیں اور جو چیزیں مسلمانوں کے مفاد میں ہیں خواہ مخواہ ان کی مخالفت بھی نہ کریں۔ مثال کے طور پر آج صرف شک کی بنیاد پر مرکزی مدرسہ بورڈ کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں کا شک دور کریں اور بورڈ کی مشروط حمایت کے ساتھ اسے منظوری دلائیں۔

تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ دہلی کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ذکی اللہ مصباحی نے بورڈ کی حمایت کی بات کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کو مرکزی مدرسہ بورڈ تشکیل دینے میں اگر دلچسپی ہے تو وہ مسلمانوں کو باہم الجھانے کی بجائے اسے سرد بستے میں نہ ڈال کر ضروری ترامیم کر کے اس کی بل پاس کرے۔ ہمیں اس تعلق سے مثبت جدوجہد کرتے ہوئے مسلمانوں کی رائے عامہ ہموار کرنا ہوگا۔ ہماری تنظیم اس سمت میں بھرپور کوشش کرے گی۔ اس اجلاس میں دہلی اور اطراف میں رہنے والے تنظیم ابنائے اشرفیہ کے ارکان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ خاص شرکا میں مولانا اشرف الکوثر جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولانا قاسم مصباحی این. سی. پی. یو. ایل، مولانا نیاز احمد مصباحی، مولانا غلام صمدانی، مولانا امتیاز احمد مصباحی جے این یو، مولانا محمد شہباز عالم مصباحی نائب ایڈیٹر ماہ نور دہلی، مولانا محمد احمد مصباحی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ذیشان احمد مصباحی ایڈیٹر جام نور دہلی وغیرہ کے نام بطور خاص ذکر ہیں۔

تنظیم ابنائے اشرفیہ شاخ دہلی کی تشکیل جدید کے بعد مولانا سجاد عالم مصباحی کو صدر، مولانا افضل مصباحی کو نائب صدر، مولانا محمد ذکی اللہ مصباحی کو سکریٹری، مولانا امتیاز عالم مصباحی کو نائب سکریٹری، مولانا ظفر الدین برکاتی کو خزانچی اور مولانا شاہد جمال کو میڈیا انچارج منتخب کیا گیا۔ دوران میٹنگ درج ذیل تجاویز باتفاق رائے پاس ہوئیں۔

(۱) مجوزہ مرکزی مدرسہ بورڈ کی مشروط حمایت۔

(۲) صوبائی مدرسہ بورڈ کی فاضل ڈگریوں کو ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور روزگار کے لیے بھی گریجویشن کا درجہ دیا جائے۔

(۳) تمام یونانی طبیہ کالج میں الگ سے عربی وفارسی کا پروفیسر مقرر کیا جائے۔

(۴) حج کمیٹی، وقف بورڈ، درگاہوں اور خانقاہوں کے چیرمین اور ممبران کی تقرری کے لیے خانقاہوں، درگاہوں اور صوفی ازم میں اعتقاد رکھنے والے لوگوں کو اس کا اہل قرار دیا جائے۔ چوں کہ نوے فیصد سے زیادہ یہی مسلمان ہیں۔

(۵) (الف) ۔ شیڈول کاسٹ کی طرح مسلم طلبہ کو بھی ہوسٹل کی سہولیات مہیا کرائی جائیں۔ اور ان ہوسٹلوں کا نام علامہ فضل حق، ٹیپو سلطان اور مولانا محمد علی جوہر علی دیا جائے۔

(ب) ۔ سچر کمیٹی کے رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دلتوں سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم جیسے میڈیکل، ٹیکنیکل، ریسرچ، مینجمنٹ وغیرہ کا کورس کرنے والے مسلم بچوں کو دلتوں کے بچوں جیسی سہولیات مہیا کرائی جائیں۔

(۶) کل آبادی کا بیس فیصد یا تین لاکھ اور اس سے زیادہ اقلیتی آبادی والے اضلاع کو اقلیتی اکثریتی اضلاع میں شامل کیا جائے۔

(۷) مشرقی اتر پردیش میں ایک اقلیتی یونیورسٹی کا قیام کیا جائے اور اس یونیورسٹی کا نام ملک کے عظیم مجاہد علامہ فضل حق خیر آبادی یا سرکار عالم پناہ وارث پاک سے منسوب کیا جائے۔

(۸) لبراہن کمیشن رپورٹ کے مطابق بابری مسجد کی شہادت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث تمام لوگوں پر مقدمہ چلایا جائے۔ ساتھ ہی تمام فسادات سے متاثر لوگوں کو ۱۹۸۴ء کے فساد زدہ لوگوں جیسی تمام تر سہولیات دی جائیں۔

(۹) پورے ملک میں اوقاف کی جائداد سے ناجائز قبضوں کو ہٹا کر ان جائداد کو مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی مفادات میں استعمال کرنے کے لیے مثبت قدم اٹھایا جائے۔

(۱۰) جہاں کہیں بھی اقلیتی طبقے کے اداروں میں قیام و طعام (ہوسٹل) کا انتظام کیا جاتا ہے، ان میں مقیم بچوں کی تعداد کے مطابق ان کو .B.P.L کا کارڈ بنایا جائے اور ملک کے ہر ضلع کے ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر سے .B.P.L کے طرز پر راشن، تیل وغیرہ فراہم کیا جائے۔

(۱۱) ملک کے ہر گرام پنچایت میں قبرستانوں کی گھیرابندی، پانی، بجلی اور شجر کاری وغیرہ کا خاص انتظام کیا جائے۔ اور جس گاؤں میں قبرستان کی زمین نہیں وہاں قبرستان کی زمین فراہم کرائی جائے۔

(رپورٹ: شاہد جمال، روزنامہ ہمارا سماج، دہلی)

جرم اُن کا ہے تو پھر ان کو سزا دی جائے

بابری مسجد انہدام کی ۱۷/ویں برسی اور لبراہن کمیشن رپورٹ کے تعلق سے مرکزی تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور کے زیر اہتمام جامعہ اشرفیہ کے سربراہ اعلیٰ علامہ عبد الحفیظ صاحب کی صدارت میں ایک احتجاجی مجلس کا انعقاد کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں علما و دانش وران اور طلبہ نے شرکت کی۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے کہا کہ ۶/ دسمبر کے الم ناک حادثے اور اس کے بعد پیش آنے والی صورت حال نے ملک میں مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ اور انھوں نے زہر بھری پھنکاروں سے سماج کو فرقہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم کر دیا۔ گرم ہندوتو کی آگ اتنی تیز ہو گئی کہ سیکولرازم کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن ہندوستان کے باہوش عوام نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ ہم مرکزی حکومت سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ بابری مسجد کی تعمیر نو کے لیے سنجیدگی سے غور کرے اور بابری مسجد کو سیاست کا اکھاڑہ نہ بننے دے۔ مسلسل ناکامیوں کے بعد اب پھر سماج وادی پارٹی اور بی. جے. پی. نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے مگر اب ملک کا ہندو اور مسلمان ان کے چکر میں آنے والا نہیں ہے، مولانا مصباحی نے مزید کہا کہ جسٹس لبراہن کی تیار کردہ رپورٹ میں بابری مسجد انہدام کے اہم حقائق سے پردہ ہٹایا گیا ہے اور مجرمین کی ایک فہرست تیار کی گئی ہے، جن بڑے مجرموں کے نام جسٹس لبراہن نے شمار کیے ہیں ان میں سابق وزیر اعظم واجپئی، ایل کے اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، کلیان سنگھ اور بال ٹھاکرے ہیں، لیکن مجرمین کے شمار کرنے سے ان آنسوؤں کا خراج ادا نہیں ہو سکتا جو عدل انصاف کی بے حرمتی اور آئین و قانون کی عصمت دری کے مناظر دیکھ کر نکلے تھے، لہٰذا درج فہرست مجرمین کو جلد از جلد سزا دیا جانا ضروری ہے تاکہ سازشی ذہنوں کو نفرت کی نئی فصل اگانے کا موقع نہ ملے۔

جامعہ اشرفیہ کے ناظم اعلیٰ حاجی سرفراز نے کہا کہ جسٹس لبراہن نے صرف ۶۸/ مجرمین کو فہرست میں درج کیا ہے لیکن یہ تعداد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ پولس کے ہزاروں جوانوں نے انہدام میں اہم رول ادا کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ یوپی پولس وردی کے ساتھ کارسیوک بن گئی تھی، کلیان سنگھ نے انتظامیہ اور پولس کے ان افسران کا بھی تبادلہ کر دیا تھا جنہوں نے کارسیوکوں سے ساز باز کرنے میں جھجک کا مظاہرہ کیا تھا، لہٰذا نفرت پھیلانے والے سازشی عناصر کی حرکتوں کے سد باب کے لیے ضروری ہے کہ درج فہرست مجرمین کے ساتھ سخت تعزیری کرروائی کی جائے۔

مولانا زاہد علی سلامی و مفتی بدر عالم مصباحی نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ صرف مجرموں کو سزا دینے سے ہندوستان بھر میں پھیلی نفرت کی سیاست کو ختم نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے اس شجر کو ختم کرنا ضروری ہے جس پر نفرت کے پھل لگتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حکومت پورے ہندوستان میں موجود ان انگنت ہندو تنظیموں پر پابندی عائد کرے جو سیدھے سادے عوام میں نفرت کی آگ بھڑکا کر اپنے منصوبوں میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں، مولانا سلامی نے مزید کہا کہ رپورٹ میں مذکور مجرمین کی تعداد بہت کم ہے لیکن اگر انہی کو سزا مل جائے تو ہندوستانی جمہوریت کی بہت بڑی جیت ہو گی۔

مولانا نعیم الدین عزیزی مصباحی نے کہا کہ بابری مسجد انہدام ہندوستان کی تاریخ کا سیاہ باب ہے، لیکن ہمیں اس کے پس پردہ کار فرما عوامل پر غور کرنا چاہیے۔ جسٹس لبراہن کے مطابق یوپی پولس نے بابری مسجد انہدام میں کارسیوکوں کی کھلی مدد کی تھی جس میں سے فیض آباد کے ایس. ایس. پی. کا نام درج فہرست مجرمین میں شامل ہے، لہٰذا اس طرح کے جمہوریت شکن واقعات کے سد باب کے لیے پولس کی تطہیر اور سیکولر تربیت نہایت ضروری ہے۔

مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا ساجد علی مصباحی، مولانا حسیب اختر مصباحی، مولانا ناصر علی مصباحی، مولانا اسلم مصباحی، مہتاب پیامی و متعدد علما و دانش وران نے شرکت کی۔

از: ابرار عزیزی

☆☆☆

ماہنامہ اشرفیہ حاصل کریں

سیتا مڑھی میں
رضا بک ڈپو
مقام و پوسٹ پریہار
سیتا مڑھی، بہار۔ 843324

اورنگ آباد میں
عزیزی بک ڈپو
نواڈیہہ روڈ
اورنگ آباد، بہار۔

خیر و خبر

دنیا کی پانچ سو با اثر مسلم شخصیات میں حضرت امین ملت اور شیخ ابوبکر احمد بھی شامل

علی گڑھ ۱۰/ دسمبر: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر سید محمد امین میاں قادری کو جارج ٹاؤن یونیورسٹی، امریکہ کے رائل اسلامک اسٹریٹیجک اسٹڈیز سینٹر نے دنیا کے سب سے با اثر مسلمانوں میں ۴۴/ویں مقام پر شمار کیا ہے۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں ایڈمنڈ اے والش اسکول آف فارین سروس کے ماتحت ادارے پرنس الولید بن طلال سینٹر فار مسلم کرسچین انڈر اسٹینڈنگ نے دنیا کے ۵۰۰/ سب سے با اثر مسلمانوں پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں پروفیسر سید محمد امین میاں قادری کو ۴۴/ویں سب سے با اثر مسلم قائد کی حیثیت سے شمار کیا ہے۔

پروفسر سید محمد امین میاں قادری جنوب ایشائی خطے میں ایک اہم صوفی تحریک کے قائد ہیں۔ یہ سلسلہ اس علاقے میں ایک طاقت ور صوفی تحریک کے طور پر سرگرم رہا ہے۔ بریلوی مسلک ایک غیر سیاسی جماعت ہے جس کا سارا زور معاشرتی رواداری اور روحانی بزرگی کے حصول پر ہوتا ہے۔ پروفیسر سید محمد امین بے شمار جدید اور روایتی تعلیمی اداروں کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب پر کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور صوفی سلسلوں پر مبنی کئی کتب کے تراجم بھی کیے ہیں۔ پروفیسر سید محمد امین البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس کے بانی بھی ہیں جس کے تحت کئی تعلیمی ادارے سرگرم عمل ہیں۔

اس کتاب میں ہندوستان کی جن شخصیات کو شامل کیا گیا ہے اس میں جامعہ مرکز کالی کٹ کیرالا کے سربراہ اعلیٰ داعی کبیر شیخ ابو بکر احمد (جنرل سکریٹری آل انڈیا سنی جمعیۃ العلما) بھی شامل ہیں۔ جنھیں یتیموں کی کفالت اور خدمتِ خلق سمیت ابتدائی درجہ سے لے کر ڈگری تعلیم کے معقول انتظامات کے اعتراف کے ساتھ ایڈمنسٹریٹر کا مقام دیا گیا ہے۔

مبارک باد

دنیا کی ۵۰۰ اہم مسلم شخصیات میں مختلف میدانوں کی اہم شخصیات کو لیا گیا ہے۔ ہمارے لیے یہ مسرت و فخر کی بات ہے کہ اس عالمی سطح کی منتخب فہرست میں انتہائی اہم دو نام ہندوستانی قبیلہ اہل سنت کے بھی ہیں۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، تنظیم ابنائے اشرفیہ انٹر نیشنل اور آل انڈیا مدرسہ کو آرڈی نیشن کمیٹی کی جانب سے ہم دونوں اہم شخصیات کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں شخصیتوں کی عمر میں درازی اور اقبال میں مزید بلندی عطا فرمائے۔ آمین۔

از: مبارک حسین مصباحی

سراج العلوم میں جشنِ استقبالیہ

مدرسہ اشرفیہ سراج العلوم نوادہ میں بقیۃ السلف حجۃ الخلف بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری کو اجراے فتاویٰ بحر العلوم اور چاندی سے تولنے کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جشن استقبالیہ کا پروگرام مورخہ ۱۲/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز جمعرات منعقد ہوا، جس کی نظامت حافظ محمد اکرم نے کی۔ پروگرام کا آغاز قاری محمد صابر علی نے تلاوت کلام اللہ سے کیا۔ اس کے بعد انجمن تنظیم نو، نوادہ کے ممبران نے حضرت کی شان میں تہنیت پیش کی پھر علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب، مفتی نظام الدین صاحب اور علامہ عبد المبین نعمانی صاحب نے حضرت کے تبحرِ علمی پر روشنی ڈالی مفتی نظام الدین رضوی صدر شعبہ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے فرمایا کہ سائل کے سوال اور اس کی نیت کا سمجھنا فتویٰ نویسی میں بہت ہی مشکل اور اہم ہوتا ہے، الحمد للہ! فتاویٰ بحر العلوم کے اندر یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور متعدد مثالوں سے حضرت مفتی صاحب نے اس کو خوب اجاگر فرمایا۔ حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب چیف ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ نے بیان کیا کہ حضرت بحر العلوم صاحب ایک ماہر مدرس، عمدہ خطیب، شیخ الحدیث، جید مفتی، فصیح و بلیغ شاعر و ادیب ہیں۔ اپنی تحریروں میں جا بجا مناسب و موزوں اشعار کا بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد مدرسہ ہذا کے ناظم اعلیٰ الحاج جمال احمد، صدر اعلیٰ الحاج قمر الحق، پرنسپل حافظ نفیس احمد، مولانا انتظام اللہ، مولانا اسلم رضا، قاری محمد نسیم، مولانا نعیم اختر، نائب صدر الحاج نیک محمد، نائب ناظم الحاج حفیظ الرحمٰن، ناظم تعلیمات الحاج نثار احمد، الحاج محمد مصطفیٰ خازن، عتیق الزماں محاسب، الحاج محمد یونس سابق چیرمین، الحاج سرفراز احمد صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، الحاج محمد اشہد، الحاج سراج الدین، صوفی

نظام الدین، الحاج اقبال احمد خیر آباد، الحاج اخلاق احمد خیر آباد، الحاج صلاح الدین محمد آباد، مولانا نذیر احمد منانی ابراہیم پور، محمد جاوید نیتا، ڈاکٹر افتخار الحسن کرہاں، جناب مہدی حسن سابق پردھان، الحاج عارف نسیم بنارس، مولانا اسرار الحسن وجملہ اراکین ادارہ و دیگر علمائے کرام و معززین قصبہ اور اطراف و نواح کے نام ور لوگوں نے حضرت کی بارگاہ میں گل ہائے عقیدت پیش کیے اور حضرت سید لئیق احمد قبلہ سندیلہ شریف کے مقدس ہاتھوں حضرت بحر العلوم صاحب قبلہ کو سکوں سے تولا گیا۔ بعدہ صلاۃ وسلام اور حضور سید لئیق احمد صاحب قبلہ کی دعاؤں پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

از: **مدرسہ اشرفیہ سراج العلوم**، نوادہ، مبارک پور

جامعہ حضرت مولانا نور الدین للبنات میں جلسۂ افتتاح

ضلع اتر دیناج پور مغربی بنگال کے شہر اسلام پور سے شمالی جانب ۷ / کلومیٹر دور واقع جامعہ حضرت مولانا نور الدین للبنات ٹیلر نگ اینڈ نرسنگ سینٹر میں ۱۸ / جولائی ۲۰۰۹ء کو بڑے پیمانے پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت کے فرائض مفتی محمد ذاکر حسین مصباحی ناظم اعلیٰ جامعہ طیبۃ الرضا حیدر آباد نے انجام دیے ہمہ سرپرستی سید شاہ نور علی، صاحب سجادہ خانقاہ سمر قندیہ در بھنگہ بہار کی رہی۔ آپ کے مبارک ہاتھوں سے تعلیمی اقسام کے مراسم انجام دیے گئے اور اس علاقے کی بزرگ باوقار ہستی مولانا الحاج نور الدین نوری کی نگرانی رہی۔

چاندا پور شریف میں عرس مجیدی منایا گیا

عارف باللہ مجید ملت حضرت صوفی عبد المجید چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا عرس مجیدی ہر سال ۳/ ۴/ دسمبر کو منایا گیا۔ ۳/ دسمبر بعد نماز ظہر پروگرام شروع ہوا جس کا آغاز قاری احسان برکاتی نے تلاوت کلام پاک سے کیا، محمد ندیم مجیدی نے نعتیہ کلام پیش کیا۔ نظامت قاری ارمان صاحب نے فرمائی۔ اکمل کان پوری اور مطلوب منظر برکاتی نے منقبتیں پڑھیں۔ پھر مولانا صاحب عالم مجیدی نے بزرگوں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی۔ بعد نماز مغرب چادر پوشی اور بعد نماز عشا فاتحہ خوانی ہوئی۔ غلام رسول برکاتی، ڈاکٹر ضمیر الحسن، علاء الدین نے منقبت پیش کی، مولانا مسعود عالم مصباحی مجیدی کا خطاب ہوا۔ پروگرام میں مولانا عمر رضا برکاتی، مولانا آصف چشتی، مولانا شاہد عالم، مولوی الیاس نظامی، حاجی عبد السلام مجیدی و دیگر علما نے شرکت کی۔ جب کہ سرپرستی صوفی سعید عالم چشتی مجیدی سجادہ نشیں خانقاہ مجیدیہ نے فرمائی۔ قل شریف کی فاتحہ ۴/ دسمبر کو ۸/ بجے صبح کو ہوئی۔

از: ناظم عرس کمیٹی **مسعود عالم مصباحی**

سنبھل میں جلسۂ دعوتِ فکر و عمل

۱۸/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز بدھ بعد نماز عشا جامعہ تعلیم القرآن موضع حاجی پور، سنبھل مراد آباد میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مفتی اشفاق حسین نعیمی نے فرمائی۔ نظامت قاری محمد یوسف نے کی۔ مولانا شائق القادری نے نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ مولانا قاری علاء الدین اجملی نے سماج میں پھیلی ہوئی رسومات بد اور بڑھتی ہوئی برائیوں کے خلاف تقریر فرمائی۔ حضرت علامہ محمد ہاشم صاحب جامعہ نعیمیہ مراد آباد کا موضوع "دورِ جدید کا چیلنج اور اسلام" تھا۔ آخری تقریر ہاشم کان پوری نے فرمائی۔ اختتام صلاۃ وسلام اور دعا پر ہوا۔

از: **نفیس اختر نوری اشفاقی**

پنڈوہ شریف میں عرسِ اشرف الاولیا

۱۰/ نومبر ۲۰۰۹ء مخدوم اشرف مشن پنڈوہ شریف میں بانی مخدوم اشرف مشن سید شاہ محمد مجتبیٰ اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمۃ کا بارہواں سالانہ عرس ساتھ منایا گیا جس میں اساتذہ و طلبۂ مخدوم اشرف مشن کے علاوہ کثیر تعداد میں عوام وخواص نے شرکت کی۔ بعدِ نمازِ ظہر قرآن خوانی اور بعدِ مغرب میلاد خوانی کا پروگرام ہوا۔ محفل کا آغاز قاری محمد ریاض الحسن نے تلاوتِ کلام الٰہی سے کیا، طلبۂ جامعہ نے نعت و مناقب کے گل دستے پیش کیے۔ اس اجلاس میں بیت بازی اور اسلامی کوئز کے مقابلوں میں بھی طلبۂ جامعہ نے حصہ لیا۔ اسلامی کوئز اور نعت و منقبت میں حصہ لینے والے طلبہ انعامات سے نوازا گیا۔

اخیر میں مفتی عبد الخبیر اشرفی نے اپنے خطاب میں اشرف الاولیا علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی اور فرمایا، حضور اشرف الاولیا نہایت ہی محتاط، تقویٰ شعار، پرہیز گار، کامل الاحوال اور ۱۱/ بج کر ۳۰/ منٹ پر قل شریف وفاتحہ خوانہ ہوئی اور آخر میں حضرت علامہ و مولانا عبد الودود مصباحی کی دعا پر محفل کا اختتام ہوا۔

از: **محمد نظام حسین اشرفی**
مخدوم اشرف مشن پنڈوہ شریف، مالدہ

R.N.I. No.: 29292/76 Regd. No.: AZM/N.P.28
THE ASHRAFIA MONTHLY
Mubarakpur, Azamgarh (U.P.)-276 404 (INDIA) Phone: (05462) 250092, 250149, Fax: 251448
http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail:info@aljamiatulashrafia.org January 2010

ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور کا

صفحات ۱۱۲ | قیمت -/25 روپئے

انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر

منظر عام پر آچکا ہے

یہ نمبر حسب ذیل ابواب کے تحت گراں قدر تاریخی حقائق اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔

- انقلاب 1857ء - مسائل ومباحث
- انقلاب 1857ء - کے چند فکر انگیز پہلو
- انقلاب 1857ء - میں فارسی اور اردو شعروادب کا کردار
- انقلاب 1857ء - کی سرکردہ شخصیات
- انقلاب 1857ء - اور مابعد انقلاب 1857ء

خواہش مند حضرات اولین فرصت میں رابطہ قائم کریں۔

ملنے کا پتہ دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی 276404
فون نمبر: 05462-250149